گلزارِ اُردو

دسویں جماعت کے لیے اردو کی معاون درسی کتاب

© NCERT
not to be republished

5019

نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

NATIONAL COUNCIL OF EDUCATIONAL RESEARCH AND TRAINING

Gulzar-e-Urdu, Supplementary Reader for Class X

ISBN 81-7450-687-X

پہلا اردو ایڈیشن

جنوری **2007** ماگھ **1928**

دیگر طباعت

فروری **2015** ماگھ **1936**

جون **2017** آشاڑھ **1939**

جنوری **2018** پوش **1939**

فروری **2019** ماگھ **1940**

PD 3T SPA

© نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ **2007**

جُملہ حقوق محفوظ

- ناشر کی پہلے سے اجازت حاصل کیے بغیر، اس کتاب کے کسی بھی حصے کو دوبارہ پیش کرنا، یادداشت کے ذریعے بازیافت کے سسٹم میں اس کو محفوظ کرنا یا برقیاتی، میکانیکی، فوٹو کاپینگ، ریکارڈنگ کے کسی بھی وسیلے سے اس کی ترسیل کرنا منع ہے۔
- اس کتاب کو اس شرط کے ساتھ فروخت کیا جا رہا ہے کہ اسے ناشر کی اجازت کے بغیر، اس شکل کے علاوہ جس میں کہ یہ چھاپی گئی ہے یعنی، اس کی موجودہ جلد بندی اور سرورق میں تبدیلی کر کے، تجارت کے طور پر نہ تو مستعار دیا جا سکتا ہے، نہ دوبارہ فروخت کیا جا سکتا ہے، نہ کرایہ پر دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی تلف کیا جا سکتا ہے۔
- کتاب کے صفحہ پر جو قیمت درج ہے وہ اس کتاب کی صحیح قیمت ہے۔ کوئی بھی نظرثانی شدہ قیمت چاہے وہ ربر کی مہر کے ذریعے یا چِپّی یا کسی اور ذریعے ظاہر کی جائے تو وہ غلط متصوّر ہوگی اور ناقابلِ قبول ہوگی۔

این سی ای آر ٹی کے پبلی کیشن ڈویژن کے دفاتر

این سی ای آر ٹی کیمپس
سری اروندو مارگ
نئی دہلی - 110016 **فون** 011-26562708

108,100 فٹ روڈ ہوسڈے کیرے ہیلی
ایکسٹینشن بناشنکری III اسٹیج
بنگلور - 560085 **فون** 080-26725740

نوجیون ٹرسٹ بھون
ڈاک گھر، نوجیون
احمد آباد - 380014 **فون** 079-27541446

سی ڈبلیو سی کیمپس
بمقابل ڈھانکل بس اسٹاپ، پانی ہاٹی
کولکتہ - 700114 **فون** 033-25530454

سی ڈبلیو سی کامپلیکس
مالی گاؤں
گواہاٹی - 781021 **فون** 0361-2674869

قیمت: ₹ **70.00**

اشاعتی ٹیم

ہیڈ، پبلی کیشن ڈویژن : محمد سراج انور
چیف ایڈیٹر : شویتا اُپّل
چیف پروڈکشن آفیسر : ارون چتکارا
چیف بزنس منیجر : ابیناش کُلّو
ایڈیٹر : سید پرویز احمد
پروڈکشن اسسٹنٹ : اوم پرکاش

سرورق اور آرٹ

للت کمار موریا اور وی۔ منیشا

این سی ای آر ٹی واٹر مارک 80 جی ایس ایم کاغذ پر شائع شدہ

سکریٹری، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، شری اروندو مارگ، نئی دہلی 110016 نے تاج پرنٹرز، 6A / 69 نجف گڑھ روڈ انڈسٹریل ایریا، نزد کیرتی نگر میٹرو اسٹیشن، نئی دہلی 110015 میں چھپوا کر پبلی کیشن ڈویژن سے شائع کیا۔

© NCERT not to be republished

پیش لفظ

’قومی درسیات کا خاکہ—2005‘ میں سفارش کی گئی ہے کہ بچّوں کی اسکول کی زندگی ان کی باہر کی زندگی سے ہم آہنگ ہونی چاہیے۔ یہ زاویۂ نظر، کتابی علم کی اس روایت کی نفی کرتا ہے جس کے باعث آج تک ہمارے نظام میں گھر اور سماج کے درمیان فاصلے حائل ہیں۔ نئے قومی درسیات کے خاکے پر مبنی نصاب اور درسی کتابیں اسی بنیادی خیال پر عمل آوری کی ایک کوشش ہے۔ اس کوشش میں مختلف مضامین کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے اور رٹ کر پڑھنے کے طریقۂ کار کی حوصلہ شکنی بھی شامل ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان اقدامات سے قومی تعلیمی پالیسی 1986 میں مذکور ’تعلیم کے طفل مرکوز نظام‘ کی طرف مزید پیش رفت ہوگی۔

اس کوشش کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ سبھی اسکولوں کے پرنسپل اور اساتذہ بچوں میں اپنے تاثرات خود ظاہر کرنے اور ذہنی سرگرمیوں اور سوالوں کے ذریعے سیکھنے کی ہمّت افزائی کریں۔ ہمیں یہ ضرور تسلیم کرنا چاہیے کہ بچوں کو اگر موقع، وقت اور آزادی دی جائے تو وہ بڑوں سے حاصل شدہ معلومات سے وابستہ ہوکر، نئی معلومات مرتّب کرتے ہیں۔ آموزش کے دوسرے ذرائع اور محل وقوع کو نظر انداز کرنے کے بنیادی اسباب میں سے ایک اہم سبب مجوّزہ درسی کتاب کو امتحان کے لیے واحد ذریعہ بنانا ہے۔ بچّوں کے اندر تخلیقی صلاحیت اور پیش قدمی کے رجحان کو فروغ دینا اسی وقت ممکن ہے جب ہم آموزشی عمل میں بچوں کو بحیثیت شریک کار قبول کریں اور اُن سے اسی طرح پیش آئیں۔ انھیں محض مقررہ معلومات کا پابند نہ سمجھیں۔

یہ مقاصد اسکول کے معمولات اور طریقۂ کار میں معقول تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ روزمرہ نظام الاوقات (Time-Table) میں لچیلا پن اُسی قدر ضروری ہے جتنی کہ سالانہ کیلینڈر کے نفاذ میں سخت محنت کی تاکہ مطلوبہ ایام کو حقیقتاً تدریس کے لیے وقف کیا جاسکے۔ تدریس اور اندازۂ قدر کے طریقوں سے بھی اس امر کا تعین ہوگا کہ یہ درسی کتاب، بچوں میں ذہنی تناؤ اور اکتاہٹ کا ذریعہ بننے کے بجائے ان کی اسکولی زندگی کو خوش گوار بنانے میں کس حد تک مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ نصابی بوجھ کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے نصاب سازوں نے مختلف سطحوں پر معلومات کی تشکیلِ نو اور اسے نیا رخ دینے کی غرض سے بچوں کی نفسیات اور تدریس کے لیے دستیاب وقت پر زیادہ سنجیدگی کے ساتھ توجہ دی ہے۔ اس مخلصانہ کوشش کو مزید بہتر بنانے کے لیے یہ درسی کتاب سوچنے اور محسوس کرنے کی تربیت، چھوٹے گروہوں میں بحث ومباحثہ کرنے اور عملاً انجام دی جانے والی سرگرمیوں کو زیادہ اوّلیت دیتی ہے۔

© NCERT not to be republished

این سی ای آر ٹی اس کتاب کے لیے تشکیل دی جانے والی ''کمیٹی برائے درسی کتاب'' کی مخلصانہ کوششوں کی شکر گزار ہے۔ کونسل زبانوں کے مشاورتی گروپ کے چیئر پرسن پروفیسر نامور سنگھ اور اس کتاب کے خصوصی صلاح کار پروفیسر شمیم حنفی کی ممنون ہے۔ اس درسی کتاب کی تیاری میں جن اساتذہ نے حصّہ لیا، ہم ان کے متعلقہ اداروں کے بھی شکر گزار ہیں۔ ہم ان سبھی اداروں اور تنظیموں کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنے وسائل، مآخذ اور عملے کی فراہمی میں فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ ہم وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے شعبے برائے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کی جانب سے پروفیسر مرنال مری اور پروفیسر جی۔ پی۔ دیش پانڈے کی سربراہی میں تشکیل شدہ نگراں کمیٹی (مانیٹرنگ کمیٹی) کے اراکین کا بھی خصوصی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنا قیمتی وقت اور تعاون ہمیں دیا۔ باضابطہ اصلاح اور اپنی اشاعت کے معیار کو مسلسل بہتر بنانے کے مقصد کی پابند ایک تنظیم کے طور پر این سی ای آر ٹی، تمام مشوروں اور آرا کا خیر مقدم کرتی ہے تا کہ کتاب کو مزید غور وفکر کے بعد اور زیادہ کارآمد اور بامعنی بنایا جاسکے۔

نئی دہلی

دسمبر 2006

ڈائریکٹر

نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

© NCERT not to be republished

اس کتاب کے بارے میں

کونسل کے زیرِ اہتمام تیار کی جانے والی 'گلزارِ اردو' دسویں جماعت کی معاون درسی کتاب ہے۔اس کا خاص مقصد اردو زبان و ادب سے طلبا کی دلچسپی میں اضافہ کرنا ہے۔ اسباق کے انتخاب میں طلبا کی ذہنی سطح، نفسیات اور قومی مزاج کے ساتھ ساتھ زبان و بیان میں اُن کی دلچسپی کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔ یہ بات بھی پیش نظر رہی ہے کہ اردو کو صرف ادب کی زبان کے طور پر ہی نہ پڑھایا جائے بلکہ طلبا اس کے علمی سرمائے کی قدر و قیمت سے بھی آ گاہ ہوسکیں۔

نویں جماعت میں طلبا کو اردو شاعری کی نمائندہ اصناف سے روشناس کرایا گیا ہے۔اس کتاب کا مقصد دسویں جماعت کے طلبا کو اردو نثر کی دو اہم صنفوں افسانے اور خاکے سے متعارف کرانا ہے۔ ہر سبق سے پہلے مصنف کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ہر سبق کے آخر میں چند سوالات دیے گئے ہیں۔ ان سوالات کا مقصد طلبا میں ادب فہمی اور تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا ہے۔

کتاب کی تیاری کے لیے اردو اساتذہ، ماہرینِ تعلیم اور ایک خصوصی صلاح کار پر مشتمل کمیٹی تشکیل کی گئی تھی۔ان سب کے اشتراک اور تعاون سے اس کتاب کو آخری شکل دی گئی۔کونسل ان تمام شرکائے کار کی شکر گزار ہے۔

© NCERT not to be republished

بھارت کا آئین

تمہید

ہَم بھارت کے عوام متانت وسنجیدگی سے عزم کرتے ہیں کہ بھارَت کو ایک مقتدر، سماج وادی، غیر مَذھبی عَوامی جَمھُوریَه بنائیں اور اس کے تمام شہریوں کے لیے حاصل کریں۔

انصاف سماجی، معاشی اور سیاسی

آزادی خیال، اظہار، عقیدہ، دین اور عبادت

مساوات بہ اعتبار حیثیت اور موقع اور ان سب میں

اخوت کو ترقی دیں جس سے فرد کی عظمت اور قوم کے اتحاد اور سالمیت کا تیقن ہو۔

اپنی آئین ساز اسمبلی میں آج چھبیس نومبر 1949ء کو یہ آئین ذریعہ ہٰذا اختیار کرتے ہیں، وضع کرتے ہیں اور اپنے آپ پر نافذ کرتے ہیں۔

1۔ آئینی (بیالیسویں ترمیم) ایکٹ، 1976 کے سیکشن 2 کے ذریعہ ''مقتدر عوامی جمہوریہ'' کی جگہ (3-1-1977 سے)

2۔ آئینی (بیالیسویں ترمیم) ایکٹ، 1976 کے سیکشن 2 کے ذریعہ ''قوم کے اتحاد'' کی جگہ (3-1-1977 سے)

© NCERT not to be republished

کمیٹی برائے درسی کتاب

چیئرمین، مشاورتی کمیٹی برائے زبان

نامور سنگھ، پروفیسر ایمرٹس، جواہرلعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

خصوصی صلاح کار

شمیم حنفی، پروفیسر ایمرٹس، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی

چیف کوآرڈی نیٹر

رام جنم شرما، سابق پروفیسر اور ہیڈ، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن اِن لینگویجز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

اراکین

آفاق حسین صدیقی، ریٹائرڈ پروفیسر، مادھو کالج، اجین

ابن کنول، پروفیسر اور صدر، شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ابوالکلام قاسمی، پروفیسر، شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اسلم پرویز، ریٹائرڈ ایسوسی ایٹ پروفیسر، جواہرلعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

اقبال مسعود، جوائنٹ سکریٹری، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال

حدیث انصاری، اسسٹنٹ پروفیسر، اِسلامیہ کریمیہ کالج، اندور

حلیمہ سعدیہ، ٹی جی ٹی، ہمدرد پبلک اسکول، سنگم وہار، نئی دہلی

شامہ بلال، پی جی ٹی (اُردو)، جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول، نئی دہلی

صغرا مہدی، ریٹائرڈ پروفیسر، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی

© NCERT not to be republished

قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، پروفیسر اور صدر شعبۂ اُردو، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی

قدسیہ قریشی، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، ستیہ وتی کالج، اشوک وہار، دہلی

ماہ طلعت علوی، ٹی جی ٹی اُردو، جامعہ مڈل اسکول، نئی دہلی

محمد فیروز، ریڈر، شعبۂ اردو، ذاکر حسین کالج، نئی دہلی

نعیم انیس، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، کلکتہ گرلس کالج، کولکاتا

ممبر کوآرڈی نیٹر

محمد فاروق انصاری، پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن اِن لینگویجز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

© NCERT
not to be republished

اظہارِ تشکر

اس کتاب میں پریم چند کا افسانہ 'گلی ڈنڈا'، عظیم بیگ چغتائی کا 'فقیر'، علی عباس حسینی کا 'آئی سی ایس'، کرشن چندر کا 'دو فرلانگ لمبی سڑک'، دیوندر ستیارتھی کا 'اَن دیوتا'، احمد ندیم قاسمی کا 'سلطان' اور کلام حیدری کا 'سخی' شامل ہیں۔ خاکوں میں مولوی عبدالحق کا 'گدڑی کا لال— نورخاں'، اشرف صبوحی کا 'مرزا چپاتی' اور محمد طفیل کا 'جگر صاحب' منتخب کیے گئے ہیں۔ کونسل ان سبھی کے ورثا کا شکریہ ادا کرتی ہے۔ رتن سنگھ کا افسانہ 'من کا طوطا' اور جیلانی بانو کا 'دوشالہ' بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔ کونسل ان کا بھی شکریہ ادا کرتی ہے۔

اس کتاب میں شامل افسانہ نگاروں اور خاکہ نگاروں کے اسکیچ اُن تصاویر کی بنیاد پر تیار کیے گئے ہیں جو انجمن ترقی اردو (ہند) کے اردو آرکائیوز سے حاصل کی گئی ہیں۔ کونسل اس کے لیے انجمن کی شکرگزار ہے۔

اس کتاب کی تیاری کے لیے کونسل کاپی ایڈیٹر ڈاکٹر ارشاد نیر، پروف ریڈر شبنم ناز، ڈی ٹی پی آپریٹرز شائلہ فاطمہ، محمد وزیر عالم اور نرگس اسلام اور کمپیوٹر اسٹیشن انچارج پرش رام کوشک کی تہہ دل سے شکرگزار ہے۔

اس کتاب کی تیاری میں خصوصی تعاون کے لیے کونسل ڈاکٹر محمد نعمان خاں، پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن اِن لینگویجز این سی ای آر ٹی کی بھی ممنون ہے۔

© NCERT
not to be republished

بھارت کا آئین

حصہ III (دفعہ 12 سے 35)

(بعض شرائط، چند مستثنات اور واجب پابندیوں کے ساتھ)

بنیادی حقوق

کے ذریعہ منظور شدہ

حق مساوات

- قانون کی نظر میں اور قوانین کا مساویانہ تحفظ
- مذہب، نسل، ذات، جنس یا مقام پیدائش کی بنا پر عوامی جگہوں پر مملکت کے زیر انتظام
- سرکاری ملازمت کے لیے مساوی موقع
- چھوت چھات اور خطابات کا خاتمہ

حق آزادی

- اظہار خیال، مجلس، انجمن، تحریک، بود وباش اور پیشے کا
- سزا کے جرم سے متعلق بعض تحفظات کا
- زندگی اور شخصی آزادی کے تحفظ کا
- 6 سے 14 سال کی عمر کے بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کا
- گرفتاری اور نظر بندی سے متعلق بعض معاملات کے خلاف تحفظ کا

استحصال کے خلاف حق

- انسانوں کی تجارت اور جبری خدمت کی ممانعت کے لیے
- بچوں کو خطرناک کام پر مامور کرنے کی ممانعت کے لیے

مذہب کی آزادی کا حق

- آزادی ضمیر اور قبول مذہب اور اس کی پیروی اور تبلیغ
- مذہبی امور کے انتظام کی آزادی
- کسی خاص مذہب کے فروغ کے لیے ٹیکس ادا کرنے کی آزادی
- کلی طور سے مملکت کے زیر انتظام تعلیمی اداروں میں مذہبی تعلیم یا مذہبی عبادت کی آزادی

ثقافتی اور تعلیمی حقوق

- اقلیتوں کی اپنی زبان، رسم خط یا ثقافت کے مفادات کا تحفظ
- اقلیتوں کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے کے قیام اور ان کے انتظام کا حق

قانونی چارہ جوئی کا حق

- سپریم کورٹ یا کورٹ کی جانب سے ہدایات، احکام یا رٹ کے اجرا کو تبدیل کرانے کا حق

© NCERT not to be republished

ترتیب

پیش لفظ		iii
اس کتاب کے بارے میں		v

افسانہ

1. پریم چند	گِلّی ڈنڈا	2
2. عظیم بیگ چغتائی	فقیر	11
3. علی عباس حسینی	آئی۔سی۔ایس	18
4. کرشن چندر	دو فرلانگ لمبی سڑک	29
5. دیوندر ستیارتھی	اَن دیوتا	37
6. احمد ندیم قاسمی	سلطان	45
7. کلام حیدری	سخی	53
8. رتن سنگھ	من کا طوطا	60
9. جیلانی بانو	دوشالہ	69

خاکہ

10. مولوی عبدالحق	گدڑی کا لال۔نور خاں	76
11. اشرف صبوحی	مرزا چپاتی	85
12. محمد طفیل	جگر صاحب	95

© NCERT not to be republished

بھارت کا آئین

حصّہ 4 الف

بنیادی فرائض

بنیادی فرائض : 51 الف۔ بھارت کے ہر شہری کا یہ فرض ہوگا کہ وہ ——

(الف) آئین پر کار بند رہے اور اس کے نصب العین اور اداروں، قومی پرچم اور قومی ترانے کا احترام کرے؛

(ب) ان اعلیٰ نصب العین کو عزیز رکھے اور ان کی تقلید کرے جو آزادی کی تحریک میں قوم کی رہنمائی کرتے رہے ہیں؛

(ج) بھارت کے اقتدار اعلیٰ، اتحاد اور سالمیت کو مستحکم بنیادوں پر استوار کر کے ان کا تحفّظ کرے؛

(د) ملک کی حفاظت کرے اور جب ضرورت پڑے، قومی خدمت انجام دے؛

(ہ) مذہبی، لسانی اور علاقائی وطبقاتی تفرقات سے قطع نظر بھارت کے عوام الناس کے مابین یک جہتی اور عام بھائی چارے کے جذبے کو فروغ دے نیز ایسی حرکات سے باز رہے جن سے خواتین کے وقار کو ٹھیس پہنچتی ہو؛

(و) ملک کی ملی جلی ثقافت کی قدر کرے اور اُسے برقرار رکھے؛

(ز) قدرتی ماحول کو جس میں جنگلات، جھیلیں، دریا اور جنگلی جانور شامل ہیں، محفوظ رکھے اور بہتر بنائے اور جانداروں کے تئیں محبت وشفقت کا جذبہ رکھے۔

(ح) دانشورانہ رویے سے کام لے کر انسان دوستی اور تحقیقی و اصلاحی شعور کو فروغ دے؛

(ط) قومی جائیداد کا تحفظ کرے اور تشدد سے گریز کرے؛

(ی) تمام انفرادی اور اجتماعی شعبوں کی بہتر کارکردگی کے لیے کوشاں رہے تا کہ قوم متواتر ترقی و کامیابی کی منازل طے کرنے میں سرگرم عمل رہے؛

(ک) ماں، باپ یا سرپرست جو بھی ہے، چھے سے چودہ سال تک کی عمر کے اپنے بچّے یا زیر ولایت، کو تعلیم کے مواقع فراہم کرے۔

© NCERT not to be republished

افسانہ

افسانہ بیسویں صدی کے آغاز کی پیداوار ہے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے کا ساتھ دینے والوں کے لیے مختصر افسانہ خاص کشش رکھتا ہے۔

افسانہ اس کہانی کو کہتے ہیں جس میں زندگی کی سچائیوں کا بیان ہوتا ہے۔ نقادوں نے افسانے کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں ۔ ایک نقاد نے کہا ہے کہ افسانہ ایسی نثری تخلیق ہے جو ایک ہی نشست میں پڑھی جاسکے ۔ ایک اور نقاد کا قول ہے کہ افسانے میں بنیادی چیز وحدتِ تاثر ہے ۔ نقادوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ افسانوں کے کردار ہماری زندگی اور تجربوں سے مطابقت رکھتے ہوں۔

افسانہ (کہانی) اختصار کے ساتھ زندگی کے کسی اہم گوشے کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے ۔ مختصر ہونے کی وجہ سے واقعات میں جھول ہونے کے اندیشے بھی کم ہوتے ہیں ۔ افسانہ نگار کا مشاہدہ اور انسانی نفسیات کا مطالعہ گہرا ہوتا ہے ۔

اردو کے اہم افسانہ نگاروں میں پریم چند، علی عباس حسینی ، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی ، راجندر سنگھ بیدی ، کرشن چندر، غلام عباس، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے نام لیے جاسکتے ہیں ۔ ان کے بعد نئے افسانہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد بھی ہمارے سامنے آ چکی ہے ۔ اردو کی ادبی اصناف میں افسانے کا مرتبہ بہت بلند ہے ۔ بہت سے اردو افسانے دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کیے جا چکے ہیں۔

© NCERT not to be republished

منشی پریم چند

(1880 – 1936)

پریم چند کا اصلی نام دھنپت رائے تھا۔ وہ بنارس کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ان کے والد ڈاک خانے میں ملازم تھے۔ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہوئی۔اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم کے بعد انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔پرائمری اسکول میں ٹیچر ہوگئے۔تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔

پریم چند کو طالب علمی کے زمانے سے ہی مضامین لکھنے کا شوق تھا۔''اسرارِ معابد'' کے نام سے ان کا پہلا ناول بنارس کے ایک رسالے میں شائع ہونا شروع ہوا۔بعد میں وہ رسالہ'' زمانہ'' کے لیے پابندی سے مضامین اور افسانے لکھنے لگے۔ 1908 میں ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ''سوزِ وطن'' کے نام سے شائع ہوا جسے حکومت نے ضبط کرلیا۔ اب وہ پریم چند کے قلمی نام سے لکھنے لگے۔ملک میں آزادی کی تحریک پھیل رہی تھی۔ پریم چند بھی گاندھی جی کی شخصیت سے متاثر ہوئے۔1921 میں سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا۔ وہ قلم کے سپاہی بن گئے اور اپنی تحریروں کو آزادی اور قومی تعمیر کے مقاصد کے لیے وقف کردیا۔

پریم چند کے افسانے اور ناول اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔انھوں نے ادب کو مقامی زندگی خاص طور پر دیہاتوں کے مسائل کا ترجمان بنا دیا۔ پریم چند کی حقیقت نگاری زندگی کے تجربات ومشاہدات کا نتیجہ ہے۔اسی خصوصیت نے انھیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کردیا۔ان کے افسانے قومی، سیاسی اور سماجی رجحانات کے آئینہ دار ہیں۔

پریم چند نے ناول اور افسانوں کے علاوہ ڈرامے اور مضامین بھی لکھے۔ان کے افسانوں کے نمائندہ مجموعے''پریم پچیسی''، ''پریم چالیسا''، ''زادِ راہ''، ''آخری تحفہ'' اور ''واردات'' ہیں۔ناولوں میں ''بیوہ''، ''بازارِ حسن''، ''گوشۂ عافیت''، ''میدانِ عمل''، ''چوگانِ ہستی'' اور ''گئودان'' بہت مشہور ہیں۔

© NCERT not to be republished

5019CH01

گِلّی ڈنڈا

ہمارے انگریزی خواں دوست چاہے مانیں یا نہ مانیں میں تو یہ ہی کہوں گا کہ گِلّی ڈنڈا سب کھیلوں کا راجا ہے۔ اب بھی جب کبھی لڑکوں کو گلی ڈنڈا کھیلتے دیکھتا ہوں تو جی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے کہ ان کے ساتھ جا کر کھیلنے لگوں۔ نہ لان (میدان) کی ضرورت ہے نہ شنگارڈ، نٹ کی نہ بلے کی۔ مزے سے کسی درخت کی ایک شاخ کاٹ لی، گلی بنائی اور دو آدمی بھی آ گئے تو کھیل شروع ہو گیا۔ ولایتی کھیلوں میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ ان کے سامان مہنگے ہوتے ہیں۔ جب تک کم از کم ایک روپیہ خرچ نہ کیجیے کھلاڑیوں میں شمار نہیں ہو سکتا۔ یہاں گلی ڈنڈا ہے کہ بغیر ہینگ پھٹکری کے لگے رنگ چوکھا دیتا ہے۔ لیکن ہم انگریزی کھیلوں پر ایسے دیوانے ہو رہے ہیں کہ اپنی سب چیزوں سے ہمیں نفرت سی ہو گئی ہے۔ ہمارے اسکولوں میں ہر ایک لڑکے سے تین چار روپے سالانہ صرف کھیل کی فیس لی جاتی ہے۔ کسی کو یہ نہیں سوجھتا کہ ہندوستانی کھیل کھلائیں جو بغیر پیسے کوڑی کے کھیلا جاتا ہے۔ انگریزی کھیل ان کے لیے ہیں جن کے پاس روپیہ ہے۔ بے چارے غریب لڑکوں کے سر پر فضول خرچیاں کیوں منڈھتے ہو۔ ٹھیک ہے، گِلّی سے آنکھ پھوٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے تو کیا کِرکٹ سے سر پھٹ جانے کا، تِلّی پھٹ جانے کا، ٹانگ ٹوٹ جانے کا خدشہ نہیں رہتا۔ اگر ہمارے ماتھے پر گلّی لگ جانے کا داغ آج تک لگا ہوا ہے تو ہمارے کئی دوست ایسے بھی ہیں جو بلّے سے گھائل ہونے کا سرٹیفکیٹ بھی رکھتے ہیں۔ خیر یہ تو اپنی اپنی پسند ہے اور بچپن کی یادوں میں گِلّی ڈنڈا ہی سب سے شیریں یاد ہے۔ وہ علی الصباح گھر سے نکل جانا، وہ درختوں پر چڑھ کر ٹہنیاں کاٹنا اور گِلّی ڈنڈے بنانا، وہ جوش و خروش، وہ لگن، وہ کھِلاڑیوں کے جمگھٹے، وہ پدنا اور پدانا، وہ لڑائی جھگڑے، وہ بے تکلّف سادگی، جس میں چھوٗت چھات، غریب امیر کی کوئی تمیز نہ تھی۔ جس میں امیرانہ چونچلوں اور غرور اور خود نمائی کی گنجائش نہ تھی، اُسی وقت بھولے گا جب گھر والے بگڑ رہے ہیں۔ والد صاحب چوکے پر بیٹھے روٹیوں پر اپنا غُصّہ اُتار رہے ہیں۔ امّاں کی دوڑ صرف دروازے تک ہے لیکن اُن کے خیال میں میرا تاریک مستقبل ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرح ڈگمگا رہا ہے اور میں ہوں کہ پدانے میں مست ہوں۔ نہ نہانے کا خیال ہے نہ کھانے کا۔ گِلّی ہے تو ذرا سی مگر اس میں دُنیا بھر کی مِٹھاس اور عاشقوں کا لُطف بھرا ہوا ہے۔

میرے ہمجولیوں میں ایک لڑکا گیا نام کا تھا۔ مُجھ سے دو تین سال بڑا ہوگا۔ دُبلا لمبا بندروں کی سی پھُرتی، بندروں کی سی لمبی

© NCERT not to be republished

لمبی اُنگلیاں، بندروں کی جھپٹ۔ گُلّی کیسی ہی ہو اس طرح جھپٹتا تھا جس طرح چھپکلی کیڑوں پر لپکتی ہے۔ معلوم نہیں اس کے ماں باپ کون تھے، کہاں رہتا تھا، کیا کھاتا تھا، پر تھا ہمارے گُلّی کلب کا چیمپین۔ جس کی طرف وہ آ جائے اس کی جیت یقینی تھی۔ ہم سب اسے دوُر سے آتا دیکھ کر اس کا استقبال کرتے تھے اور اُسے اپنا گوئیاں بنا لیتے تھے۔

ایک دِن میں اور گیا دونوں ہی کھیل رہے تھے۔ میں پد رہا تھا وہ پدا رہا تھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ پدانے میں ہم دن بھر مست رہ سکتے ہیں پدنا ایک منٹ بھی سہا نہیں جاتا۔ میں نے گلا چھڑانے کے لیے وہ سب چالیں چلیں جو ایسے موقعے پر خلافِ قانون ہوتے ہوئے بھی قابلِ معافی ہیں۔ لیکن گیا اپنا داؤں لیے بغیر پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ میں گھر کی طرف بھاگا، منّت سماجت اور خوشامد کا کوئی اثر نہ ہوا۔ گیا نے مجھے دوڑ کر پکڑ لیا اور ڈنڈا تان کر بولا ''میرا داؤں دے کر جاؤ۔ پدایا تو بڑا بہادر بن کر، پد نے کے وقت کیوں بھاگتے ہو۔''

''تم پھر پداؤ تو میں دن بھر پدتا رہوں گا؟''

''ہاں تمھیں دن بھر پدنا پڑے گا۔''

''کھانے جاؤں نہ پینے؟''

''ہاں میرا داؤں دیے بغیر کہیں نہیں جا سکتے۔''

''میں تُمھارا غلام ہوں؟''

''ہاں تُم میرے غلام ہو۔''

''میں گھر جاتا ہوں دیکھوں تم میرا کیا کر لوگے۔''

''گھر جاؤ گے کیسے، دل لگی ہے۔ داؤں دِیا ہے داؤں لیں گے۔''

''اچّھا کل میں نے تمھیں امرود کھلایا تھا وہ رکھ دو۔''

''وہ تو پیٹ میں چلا گیا۔''

''نکالو پیٹ سے، تم نے کیوں کھایا میرا امرود؟''

''امرود تم نے دیا تھا میں نے کھایا میں تم سے مانگنے گیا تھا؟''

''جب تک میرا امرود نہ دو گے میں داؤں نہ دوں گا۔''

میں سمجھتا تھا انصاف میری طرف ہے آخر میں نے کسی غرض کی وجہ سے ہی امرود کھِلایا ہوگا۔ کون کسی کے ساتھ بے غرضانہ

© NCERT
not to be republished

سلوک کرتا ہے۔ بھیک تک تو غرض ہی کے لیے دیتے ہیں۔ جب گیا نے میرا امرود کھایا تو پھر اُسے مُجھ سے داؤں لینے کا کیا حق حاصِل ہے۔ رشوت دے کر تو لوگ خون چھپا جاتے ہیں۔ وہ میرا امرود یوں ہی ہضم کر جائے گا۔ امرود پیسے کے پانچ والے تھے جو گیا کے باپ کو بھی نصیب نہ ہوں گے۔ یہ سراسر بے انصافی تھی۔

گیا نے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا ''میرا داؤں دے کر جاؤ، میں امرود سمرود کچھ نہیں جانتا۔''

مجھے اِنصاف کا زور تھا۔ ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے جانے نہ دیتا تھا۔ میں نے گالی دی۔

اس نے اس سے بھی سخت گالی دی اور گالی ہی نہیں ایک ڈنڈا بھی جما دیا۔ میں رونے لگا۔

گیا میرے اس ہتھیار کا مقابلہ نہ کر سکا۔ بھاگا، میں نے فوراً آنسو پونچھ ڈالے۔ ڈنڈے کی چوٹ بھول گیا اور ہنستا ہوا گھر پہنچا۔ میں تھانے دار کا لڑکا ایک لونڈے کے ہاتھوں پٹ گیا۔ مجھے اس وقت بھی بے عزّتی کا باعث معلوم ہوا لیکن گھر میں کسی سے شکایت نہ کی۔ انھیں دنوں والد صاحب کا وہاں سے تبادلہ ہو گیا۔ نئی دُنیا دیکھنے کی خوشی میں ایسا پھولا کہ اپنے ہمجولیوں سے جُدا ہونے کا بالکل افسوس نہ ہوا۔ والد صاحب افسوس کرتے تھے یہ بڑی آمدنی کی جگہ تھی۔ امّاں بھی افسوس کرتی تھیں۔ یہاں سب چیزیں سستی تھیں اور محلّے کی عورتوں سے لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ لیکن میں مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا۔ لڑکوں سے شیخی بگھار رہا تھا۔ وہاں ایسے گھر تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ وہاں کے انگریزی اسکولوں میں کوئی ماسٹر اگر لڑکوں کو پیٹے تو عمر قید ہو جائے۔ میرے دوستوں کی حیرت سے پھٹی آنکھیں اور متعجب چہرے صاف بتلا رہے تھے کہ میں ان کی نگاہوں میں کتنا اونچا اُٹھ گیا ہوں۔ بچوں میں جھوٹ کو سچ بنا لینے کی وہ طاقت ہوتی ہے، جسے ہم، جو سچ کو جھوٹا بنا دیتے ہیں، نہیں سمجھ سکتے۔ دوست کہہ رہے تھے ''تم خوش قسمت ہو بھائی۔ ہمیں تو اسی گاؤں میں جینا بھی ہے اور مرنا بھی ہے۔''

بیس سال گُزر گئے۔ میں نے انجینیری پاس کی ہے اور کسی ضلع کا دورہ کرتے ہوئے اِسی قصبے میں پہنچا اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرا۔ اس جگہ کو دیکھتے ہی بچپن کی اس قدر دل کش اور شیریں یاد تازہ ہو اُٹھی کہ میں نے چھڑی اُٹھائی اور قصبے کی سیر کو نکلا۔ آنکھیں کسی پیارے مسافر کی طرح بچپن کے ان مقامات کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھیں جن کے ساتھ کتنی ہی یادگاریں وابستہ تھیں لیکن اس مانوس نام کے علاوہ وہاں کوئی شناسا نہیں مِلا۔ جہاں کھنڈر تھا، وہاں پکّے مکانات کھڑے تھے۔ جہاں برگد کا ایک پُرانا درخت تھا وہاں اب ایک خوبصورت باغیچہ تھا۔ اس جگہ کی کایا پلٹ ہو گئی تھی۔ اگر اس کے نام و نشان کا عِلم نہ ہوتا تو میں اسے پہچان بھی نہ سکتا تھا۔ وہ پُرانی یادگاریں باہیں پھیلا پھیلا کر اپنے پُرانے دوستوں کے گلے لپٹنے کے لیے بے قرار ہو رہی تھیں مگر وہ دُنیا بدل گئی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اس زمین سے لپٹ کر روؤں اور کہوں کہ تم مجھے بھُول گئیں لیکن میرے دل میں تمھاری یاد تازہ ہے۔

© NCERT not to be republished

اچانک ایک کھلی جگہ مَیں نے دوتین لڑکوں کو گلّی ڈنڈا کھیلتے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے میں اپنے آپ کو بالکل بھول گیا کہ میں ایک اونچا افسر ہوں، صاحبی ٹھاٹھ ہیں، رُعب اور اختیار کے لِباس میں ہوں۔ جا کر ایک لڑکے سے پوچھا ''کیوں بیٹے یہاں کوئی گیا نام کا آدمی رہتا ہے؟''

ایک لڑکے نے گلّی ڈنڈا سمیٹ کر سہمے ہوئے لہجے میں کہا ''ہاں ہے تو۔''

لڑکا دوڑا ہوا گیا اور جلد ایک پانچ ہاتھ کے کالے دیو کو ساتھ لیے آتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے دور ہی سے پہچان لیا۔ اُس کی طرف لپکنا چاہتا ہی تھا کہ اس کے گلے سے لپٹ جاؤں مگر کچھ سوچ کر رہ گیا۔

بولا ''کہو کیا مجھے پہچانتے ہو؟''

گیا نے جُھک کر سلام کیا۔ ''ہاں مالک، بھلا پہچانوں گا کیوں نہیں، آپ مزے میں رہے؟''

''بہت مزے میں تم اپنی کہو؟''

''ڈپٹی صاحب کا سائیس ہوں۔''

''ماتا دین دُرگا دونوں ڈاکیے ہو گئے ہیں اور آپ؟''

''میں ضلع کا انجینیر ہوں۔''

''سرکار تو پہلے ہی بڑے جہین (ذہین) تھے۔''

''اب بھی گلّی ڈنڈا کھیلتے ہو؟''

میں نے گیا کی طرف سوال کی آنکھوں سے دیکھا۔

''گلّی ڈنڈا کیا کھیلوں گا سرکار۔ اب تو پیٹ کے دھندے ہی سے چھٹّی نہیں ملتی۔''

''آؤ آج ہم تم کھیلیں۔ تم پدانا ہم پدیں گے، تُمھارا ایک داؤں ہمارے اوپر ہے وہ آج لے لو۔''

گیا بڑی مشکل سے راضی ہُوا۔ وہ ٹھُہرا ٹکے کا مزدور، میں ایک بڑا آفیسر۔ میرا اور اس کا کیا جوڑ۔ بے چارہ جھینپ رہا تھا۔ لیکن مجھے بھی کچھ کم جھینپ نہ تھی۔ اس لیے نہیں کہ میں گیا کے ساتھ کھیلنے جا رہا تھا بلکہ لوگ اس کھیل کو عجوبہ سمجھ کر اس کا تماشا بنا لیں گے اور اچھی خاصی بھیڑ لگ جائے گی۔ اس بھیڑ میں وہ لُطف کہاں رہے گا لیکن کھیلے بغیر تو رہا نہیں جاتا تھا۔ آخر فیصلہ ہوا دونوں بستی سے دور تنہائی میں جا کر کھیلیں۔ وہاں کون دیکھنے والا بیٹھا ہوگا۔ مزے سے کھیلیں گے اور بچپن کی مٹھائی کو خوب مزے لے لے کر کھائیں گے۔ میں گیا کو لے کر ڈاک بنگلے پر آیا اور موٹر میں بیٹھ کر دونوں میدان کی طرف چلے اور ساتھ ہی ایک کلہاڑی لے لی۔

© NCERT not to be republished

میں متانت کے ساتھ یہ سب کچھ کر رہا تھا مگر گیا ابھی تک مذاق سمجھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی اور ولولے کا کوئی نشان نہیں تھا۔ شاید ہم دونوں میں جو فرق ہو گیا تھا وہ اُسے سوچنے میں محو تھا۔ میں نے پوچھا ''تمھیں بھی ہماری یاد آتی تھی، سچ کہنا؟''

گیا جھینپتا ہوا بولا ''میں آپ کو یاد کر کے کیا کرتا حضور! کس لائق ہوں۔ قسمت میں کچھ دن آپ کے ساتھ کھیلنا لکھا تھا نہیں تو میری کیا گنتی۔''

''وہ ڈنڈا جو تان کر جمایا تھا یاد ہے نا؟''

گیا نے شرماتے ہوئے کہا ''وہ لڑکپن تھا سرکار! اُس کی یاد نہ دلاؤ۔''

واہ! وہ میرے اُن دنوں کی سب سے رسیلی یاد ہے۔ تُمھارے اُس ڈنڈے میں جو رس تھا وہ اب نہ عزّت اور بڑائی میں پاتا ہوں، نہ دولت میں۔ کچھ ایسی مٹھاس تھی اس میں کہ آج تک اس سے من میٹھا ہوتا رہتا ہے۔

اتنی دیر میں ہم بستی سے کوئی تین میل نکل آئے تھے۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ مغرب کی طرف کوسوں بھیم تال پھیلا ہوا تھا جہاں آ کر ہم کسی وقت کنول کے پھول توڑنے جاتے تھے اور اُس کے جُھمکے بنا کر کانوں میں ڈال لیتے تھے۔ جون کی شام کیسر میں ڈوبی چلی آ رہی تھی، میں لپک کر درخت پر چڑھ گیا اور ایک شاخ کاٹ لایا۔ جھٹ پٹ گِلّی ڈنڈا بن گیا۔ کھیل شروع ہو گیا۔ میں نے راب میں گِلّی رکھ کر اُچھالی اور گِلّی گیا کے سامنے سے نکل گئی۔

اُس نے ہاتھ لپکایا۔ جیسے مچھلی پکڑ رہا ہو۔ گِلّی اُس کے پیچھے جا کر گری۔ یہ وہی گیا تھا جس کے ہاتھوں میں گِلّی آپ ہی آپ آ کر بیٹھ جاتی تھی۔ وہ داہنے بائیں ہو، گِلّی اُس کی ہتھیلی میں پہنچتی تھی۔ جیسے گِلّیوں پر جادو کر کے اُس نے بس میں کر لیا ہو۔ نئی گِلّی، پُرانی گِلّی، چھوٹی گِلّی، بڑی گِلّی، نوک دار گِلّی۔ سب ہی اُس سے مل جاتی تھیں گویا اس کے ہاتھوں میں مقناطیسی طاقت تھی جو گِلّیوں کو کھینچ لیتی ہے۔ لیکن آج گِلّیوں کو اس سے وہ محبت نہیں رہی۔ پھر تو میں نے اس کو پدانا شروع کیا۔ میں طرح طرح کے فریب کر رہا تھا۔ مشق کی کمی بے ایمانی سے پوری کر رہا تھا۔ داؤں پورا ہونے پر بھی ڈنڈا کھیلے جاتا تھا۔ حالانکہ قاعدے کے مطابق گیا کی باری آنی چاہیے تھی۔ گِلّی پر جب ہلکی چوٹ پڑتی اور وہ ذرا سی دور گر پڑتی تو لپک کر خود ہی اُٹھا لاتا اور دوبارہ ٹل لگاتا۔ گیا یہ ساری بے قاعدگیاں دیکھ رہا تھا اور کچھ نہ بولتا تھا۔ گویا اُسے تمام قاعدے قوانین بھول گئے ہوں۔ اُس کا نشانہ کتنا بے خطا تھا۔ گِلّی اس سے نکل کر ٹن سے ڈنڈے پر آ کر لگتی تھی۔ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کا کام تھا ڈنڈے سے ٹکرا جانا۔ لیکن آج وہ گِلّی ڈنڈے سے لگتی ہی نہیں ہے۔ کبھی داہنے جاتی ہے کبھی بائیں، کبھی آگے کبھی پیچھے۔

آدھ گھنٹہ پدانے کے بعد گِلّی ایک بار ڈنڈے میں آ لگی۔ میں نے دھاندلی کی ''گِلّی ڈنڈے کے بالکل پاس سے گئی ہے

مگر لگی نہیں۔''

گیا نے کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔''نہیں لگی ہوگی۔ ڈنڈے میں لگتی تو کیا میں بے ایمانی کرتا۔''

نہیں بھیّا! بھلا تُم بے ایمانی کروگے؟

بچپن میں مجال تھی میں ایسا گھپلا کر کے جیتا بچتا۔ یہ ہی گیا میری گردن پر چڑھ بیٹھتا۔ لیکن آج میں اُسے کتنی آسانی سے دھوکا دیے چلا جاتا تھا۔ گدھا ہے ساری باتیں بھول گیا۔

اچانک گلّی ڈنڈے میں لگی اور اتنے زور سے لگی جیسے بندوق چھوٹی ہو۔ اس ثبوت کے مقابل مجھے کسی طرح کا فریب چلنے کا حوصلہ اس وقت بھی نہ ہو سکا۔ لیکن کیوں نہ ایک بار سچ کو جھوٹ بنانے کی کوشش کروں، میرا حرج ہی کیا ہے۔ مان گیا تو واہ واہ، ورنہ دو چار ہاتھ تو پدنا ہی پڑے گا۔ اندھیرے کا بہانہ کر کے گلا چھڑا لوں گا پھر کون داؤں دینے آتا ہے۔ گیا نے فاتحانہ انداز سے کہا'' لگ گئی، ٹن سے بولی۔''

میں نے انجان بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا

''تم نے لگتے دیکھا، میں نے تو نہیں دیکھا۔''

''ٹن سے بولی ہے سرکار۔''

© NCERT not to be republished

''اور جو کسی اینٹ سے لگ گئی ہو۔''

میرے منھ سے یہ فقرہ کیسے نکل گیا اس پر مجھے خود حیرت ہے۔ اس سچائی کو جھٹلانا ویسا ہی تھا جیسے دن کو رات کہنا۔ ہم دونوں نے گِلّی کو ڈنڈے میں زور سے لگتے دیکھا لیکن گیا نے میرا کہنا مان لیا۔

''ہاں سرکار کسی اینٹ پر لگی ہوگی ڈنڈے میں لگتی تو اتنی آواز نہ آتی۔''

میں نے پھر پدانا شروع کیا۔ لیکن اس قدر صاف اور صریح دھوکا دینے کے بعد مجھے گیا کی سادگی پر رحم آنے لگا۔ اس لیے جب تیسری بار گلّی ڈنڈے پر لگی تو میں نے بڑی فراخدلی کے ساتھ داؤں دینا طے کر لیا۔

گیا نے کہا ''اب تو اندھیرا ہو گیا ہے بھیّا کل پر رکھو۔''

میں نے سوچا کل بہت سا وقت ہوگا۔ یہ نہ جانے کتنی دیر پدائے اس لیے اس وقت معاملہ صاف کر لینا اچھّا ہوگا۔ ''نہیں نہیں بہت اجالا ہے، تم اپنا داؤں لے لو۔''

''گِلّی سوجھے گی نہیں۔''

''کچھ پرواہ نہیں۔''

گیا نے پدانا شروع کیا۔ مگر اب بالکل مشق نہیں تھی۔ اس نے دوبارہ ٹل لگانے کا ارادہ کیا لیکن دونوں ہی بار وہ چوک گیا۔ ایک منٹ سے کم میں وہ اپنا داؤں پورا کر چکا تھا۔ بے چارہ گھنٹہ بھر پدا، لیکن ایک منٹ میں اپنا داؤں کھو بیٹھا۔ میں نے اپنے دل کی وسعت کا ثبوت دیا ''ایک داؤں اور لے لو، تم پہلے ہی ہاتھ میں ہار گئے۔''

''نہیں بھیّا اب اندھیرا ہو گیا ہے۔''

''تمھاری مشق چھوٹ گئی کیا۔ کبھی کھیلتے نہیں ہو؟''

''کھیلنے کا وقت ہی نہیں ملتا بھیا۔''

ہم دونوں موٹر میں جا بیٹھے اور چراغ جلتے جلتے پڑاؤ پر جا پہنچے۔ گیا چلتے چلتے بولا۔ ''کل یہاں گلّی ڈنڈا ہوگا۔ سب ہی پُرانے کھلاڑی کھیلیں گے۔ تُم بھی آؤ گے جب تمھیں فرصت ہو۔ سب ہی کھلاڑیوں کو بلالوں۔''

میں نے شام کا وقت دیا اور دوسرے دن میچ دیکھنے کو گیا۔ کوئی دس آدمیوں کی منڈلی تھی۔ کئی میرے لڑکپن کے ساتھی نکلے مگر بیشتر نوجوان تھے جنھیں میں پہچان نہ سکا۔ کھیل شروع ہوا۔ میں موٹر پر بیٹھے بیٹھے تماشا دیکھنے لگا۔ آج گیا کا کھیل اور اُس کی کرامت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ ٹل لگاتا تو گِلّی آسمان سے باتیں کرتی۔ کل کی سی وہ جھجھک، وہ ہچکچاہٹ، وہ بے دلی آج نہ تھی۔ لڑکپن کی جو بات تھی آج اُس نے کمال کی عروج تک پہنچا دی تھی۔ کہیں کل اُس نے مجھے اس طرح پدایا ہوتا تو میں ضرور رونے

© NCERT not to be republished

لگتا۔ اس کے ڈنڈے کی چوٹ کھا کر گلّی دو سو گز کی خبر لاتی تھی۔

پدنے والوں میں ایک نوجوان نے کچھ بدعُنوانی کی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ میں نے گلّی دبوچ لی ہے۔ گیا کا کہنا تھا کہ اُچھلی ہے۔ اس پر دونوں میں تال ٹھونکنے کی نوبت آئی۔ نوجوان دب گیا۔ گیا کا تمتمایا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ میں کھیل میں نہ تھا مگر دوسروں کے اس کھیل میں مجھے وہ ہی لڑکپن کا لُطف آ رہا تھا جب ہم سب کچھ بھول کر کھیل میں مست ہو جاتے تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ گیا کل میرے ساتھ کھیلا نہیں بلکہ کھیلنے کا بہانہ کیا۔ اُس نے مجھے رحم کے قابل سمجھا۔ میں نے دھاندلی کی، بے ایمانیاں کیں اُسے ذرا بھی غصّہ نہ آیا۔ اس لیے کہ وہ کھیل نہ رہا تھا مجھے کھلا رہا تھا۔ میرا جی دیکھ رہا تھا۔ وہ پدا کر میرا کچومر نکالنا نہیں چاہتا تھا۔ اب میں افسر ہوں۔ یہ افسری میرے اور اس کے درمیان ایک دیوار بن گئی ہے۔ میں اب اُس کا لحاظ پا سکتا ہوں، ادب پا سکتا ہوں، لیکن اس کا ہمجولی نہیں بن سکتا۔ لڑکپن تھا تب میں اُس کا ساتھی تھا۔ ہم میں کوئی بھید نہ تھا۔ یہ عہدہ پا کر اب میں اس کے رحم کے قابل ہوں اور مجھے اب وہ اپنا جوڑ نہیں سمجھتا۔ وہ بڑا ہو گیا ہے، میں چھوٹا ہو گیا ہوں۔

—— پریم چند

© NCERT not to be republished

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ مصنف نے گلی ڈنڈے کو کھیلوں کا راجہ کس بنیاد پر کہا ہے؟

2۔ گیا کے داؤں سے بچنے کے لیے ضلع انجینیر نے کون کون سی چال چلی؟

3۔ مصنف کو یہ احساس کیوں کر ہوا کہ گیا اس سے جان بوجھ کر ہار رہا تھا؟

4۔ اگر آپ گیا کی جگہ ہوتے تو آپ کا رویہ کیسا ہوتا؟

عظیم بیگ چغتائی

(1895 – 1941)

عظیم بیگ چغتائی جودھ پور (راجستھان) میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے اور ایل ایل۔ بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ جج کے عہدے پر فائز ہوئے۔

عظیم بیگ چغتائی واقعات کا بیان ہلکے پھلکے اور مزاحیہ انداز میں کرتے ہیں۔ ان کے مضامین ہوں، افسانے یا ناول ہوں، یہ خصوصیت ہر جگہ برقرار رہتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی شوخ مزاج شخص اپنی اور اپنے ساتھیوں کی شرارتیں بیان کر رہا ہے۔ عظیم بیگ چغتائی کے کردار ہمیشہ ایسی حرکتیں کرتے نظر آتے ہیں جن پر بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ ان کی بعض تحریروں میں طنز بھی ہے لیکن تیکھا پن نہیں۔ عظیم بیگ چغتائی کی تصانیف میں ''کولتار''، ''خانم''، ''شریر بیوی''، ''جنت کا بھوت''، ''مرزا جنگی'' اور ''روحِ ظرافت'' کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ مزاح نگاری کے علاوہ ''قرآن اور پردہ''، ''حدیث اور پردہ'' جیسی مذہبی اور سنجیدہ کتابیں بھی ان کی یادگار ہیں۔

© NCERT not to be republished

فقیر

ایک روز کا ذکر ہے کہ میں غسل خانے سے نہا کر برآمدہ میں جو نکلا تو کسی فقیر نے سڑک پر سے کھڑکی کی چلمن میں شاید پرچھائیں یا جنبش دیکھ کر صدا دی، ''مائی تیرے بیٹا ہوئے۔'' درحال یہ کہ نہ تو یہاں کوئی مائی تھی اور نہ کسی کو یہ گھبراہٹ تھی کہ ایک عدد لڑکا خواہ مخواہ تولّد ہوتا پھرے۔ دراصل یہ فقیر ان میں سے تھا جو مانگنا بھی نہیں جانتے۔ ذرا اِس احمق سے کوئی یہ پوچھتا کہ بے وقوف، یہ کون سی عقل مندی ہے کہ کسی سوراخ میں سے کوئی بھی ہلتی چیز دیکھ پائی اور بیٹا بیٹی تقسیم کرنا شروع کر دیے۔ پھر مجھے فقیروں سے ویسے بھی بُغض ہے۔ کیوں کہ جب کبھی مجھے کوئی فقیر ملتا ہے اور میں اسے دیکھتا ہوں تو ایسا پاتا ہوں کہ مجھ سے دو کو کافی ہو۔ چنانچہ میں نے کھڑکی کی سلاخوں میں سے چق اُٹھا کر اِس نیت سے دیکھا کہ اس سے یہ کیوں نہ پوچھ لیا جائے کہ نوکری کرے گا؟

لیکن جب میں نے دیکھا تو ایک قابلِ رحم ہستی کو پایا۔ ایک فاقہ زدہ، ضعیف العمر، چیتھڑے لگائے، بے کسی اور بے بسی کی زندہ تصویر تھا۔ سچ ہے ان لوگوں کو مانگنا بھی نہیں آتا۔ نہ تو یہ کوئی عمدہ گیت جانتے ہیں، نہ کوئی لے جانتے ہیں، نہ صدا جانتے ہیں۔ بس لیے اور دانت نکال دیے۔ یہ دکھانے کو کہ دیکھو ہم بھی اس دنیا میں رہتے ہیں اور یوں رہتے ہیں۔ مجھے اس کی حالتِ زار دیکھ کر بڑا رحم آیا اور میں نے اس سے کہا کہ گھوم کر صدر دروازے پر آ جائیے۔

صبح کا وقت تھا، میں تو چائے پینے لگا، اور گھر والی سے کہا کہ ایک انتہا سے زیادہ قابلِ رحم فقیر آیا ہے، اُسے دو چار پیسے دے دو، اور صبح کا وقت ہے، دو توس اور ایک پیالی چائے دے دو۔

جتنی مشٹنڈے فقیروں سے مجھے نفرت ہے، اس سے دوگنی نفرت میری بیوی کو ہے۔ اور اسی مناسبت سے اُن فقیروں یعنی محتاجوں سے اُلفت ہے جو واقعی رحم و کرم کے مستحق ہیں۔

خانم نے فقیر کا نام سن کر جلدی جلدی دو گرما گرم توس کو انگیٹھی پر سینک کر خوب مکھن لگایا، اور ایک پیالی میں خوب بہت سا دودھ ڈال کر چائے بنا دی۔ اور مزید برآں کچھ مٹھائی بھی رکھ دی۔ اور سینی میں چار پیسے رکھ دیے۔ اور لڑکے سے کہا فقیر کو صدر دروازہ سے اندر یعنی برآمدہ میں بٹھا کر کھلا دے۔

اب قسمت تو ہماری ملاحظہ ہو کہ وہ غریب محتاج جسے میں نے بُلایا، صدر دروازہ کی پشت پر تھا، گھوم کر آ جانا اُس کے لیے

© NCERT not to be republished

مشکل ہوا یا آتے میں کسی دوسرے سے مانگنے لگا ہوگا یا پھر اپنی راہ کھوٹی نہ کرنا چاہتا ہوگا۔ قصّہ مختصر، وہ تو آیا نہیں اور اُس کے بدلے پھاٹک میں ایک اور فقیر صاحب داخل ہوئے اور اپنی صدا لگانے بھی نہ پائے تھے کہ کتے نے اُن کا استقبال کیا۔ اُن کے پاس ایک موٹا ڈنڈا تھا، اُس کے دو چار ہاتھ نہ گھمائے تھے کہ لڑکا ناشتہ لے کر پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک فقیر صاحب گلے میں مالا ڈالے، موٹا سا فقیرانہ ڈنڈا اور فقیرانہ لباس، گلے میں جھولی، ہاتھ میں چمل، تہمد باندھے موجود ہیں۔ اُس نے کُتّے کو ڈانٹا، اور کہا ''سائیں جی برآمدہ میں آجاؤ۔'' سائیں جی نے غنیمت سمجھا اور ناشتہ شروع کیا اور اُدھر میں نے خانم سے کہا کہ پُرانا سوئیٹر اور ایک قمیص فقیر کو اور بھیج دو، سردی کا وقت ہے اور غریب مر رہا ہوگا جاڑے میں۔ خانم نے جلدی سے اک قمیص اور سوئیٹر پُرانا لیا اور لڑکے کو دیا۔ میں نے لڑکے سے پوچھا کہ فقیر کیا کہتا ہے؟'' لڑکے نے کہا ''خوب دُعائیں دے رہا ہے اور کھا رہا ہے۔'' لڑکا قمیص اور سوئیٹر لے کر پہنچا اور وہ بھی فقیر صاحب کی نذر کیا۔ اتنے میں میں چائے پی کر باہر نکلا تا کہ فقیر کو گرم کپڑے پہنے ہوئے دیکھنے سے جو خوشی حاصل ہوسکتی ہے، اُس سے لُطف اُٹھاؤں۔

میں باہر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ہٹّا کٹّا، انتہا سے زیادہ مضبوط فقیر ڈکاریں لے رہا ہے اور سوئیٹر اور قمیص ہزاروں دُعاؤں کے ساتھ لپیٹ کر جھولی میں رکھ رہا ہے۔ دراصل یہ مشٹنڈا صرف ایک سینہ کُھلی فقیروں والی کفنی پہنے تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صبح کی سرد ہوا سے لُطف اُٹھا رہا ہے۔ سینہ بالشت بھر اُونچا، داڑھی منڈی ہوئی، بلّے چڑھے ہوئے۔ مجھے دیکھتے ہی حضرت لگے

مجھے دعائیں دینے۔

اب میں آپ سے کیا عرض کروں، سارا کھایا پیا خون ہوگیا، جان سُلگ کر رہ گئی۔ جی میں تو یہی آیا کہ اِس کم بخت کا منھ نوچ لوں، ڈنڈا اور چمل اُٹھا کر لگے حضرت دُعائیں دے رخصت ہونے۔ دعاؤں میں مبالغہ اور غلو سے میری اور بھی جان جلی۔ اتنے میں خانم نے بھی جھانک کر دیکھا، وہاں بھی یہی حال ہُوا۔ اب بتایئے کیا کیا جاسکتا تھا؟ یہ ناممکن تھا کہ میں اِن حضرت کو اس طرح ستم توڑ کر چلا جانے دوں۔ میں اسی شش و پنج میں تھا کہ میرے ایک دوست بھی آ گئے۔ میں نے دولفظوں میں فقیر کی ستم آرائی بیان کی اور پھر فقیر سے کہا:

"تمھیں شرم نہیں آتی......؟"

سادہ لوحی تو دیکھیے کہ یہ حضرت اِس ریمارک کو سُن کر اپنے تھد کی طرف متوجہ ہوکر محض میری جان حزیں پر کرم گُستری کے خیال سے ذرا نیچے کر لیتے ہیں۔"کم بخت!" میں نے اور بھی جل کر کہا، "اتنے موٹے تگڑے ہوکر بھیک مانگتے ہو، بڑے شرم کی بات ہے۔"

اس کے جواب میں فقیر صاحب نے اپنے پیدائشی حقوق کا اعادہ کرتے ہوئے اُن سے دست برداری سے معذوری ظاہر کی، اور اب میں یہ سوچنے لگا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اِس بدتمیز سے کم از کم سوئیٹر اور قمیص ہی چھین لی جائے۔ میرے دوست نے کہا "یہ مُناسب نہیں ہے"، مگر حضرت وہ کسی نے کہا ہے ع

دردُاس سے پوچھیے، جس کے جگر میں ٹیس ہو

میں نے کہا خواہ ادھر کی دُنیا اُدھر ہوجائے میں اس موذی کو یہ چیزیں ہرگز ہرگز ہضم نہ کرنے دوں گا۔ میں نے اب اُس محتاج کی تلاش کرائی، مُلازم اسے تلاش کرنے گیا، میں نے ادھر فقیر صاحب کو لیا آڑے ہاتھوں۔ میں نے کہا:

"تم نوکری کیوں نہیں کرتے؟"

وہ کچھ جل کر بولا، "آپ ہی رکھ لیجیے۔"

میں نے فوراً رضامندی ظاہر کی اور دس روپیہ ماہوار اور کھانا تجویز کیا۔ فقیر صاحب اِس کے جواب میں بولے:

"اور گھر والوں کو زہر دے دوں؟"

میں نے کہا "کیوں؟"

وہ بولا: "آپ دس روپیہ دیتے ہیں، ڈھائی آنہ روز کا تو گائے رزقہ کھاتی ہے، اور ایک بیوی تین بچّے، پانچ روپیہ میں گُزر

© NCERT not to be republished

کیسے ہو؟''

''گائے بھی ہے تمھارے پاس؟'' میں نے متعجب ہوکر کہا۔

وہ بولا: ''صاحب آپ بڑے آدمی ہیں، ہم بھلا کہاں سے پیسہ لائیں جو روز تین سیر دودھ خریدیں؟''

''تین سیر؟'' میں نے متعجب ہوکر کہا۔ ''تین سیر! بھئی تین سیر کا خرچ کیسا؟'' معلوم ہُوا، خیر سے خود حضرت دو سیر دودھ یومیہ نوش کرتے ہیں۔ مَیں پھر تنخواہ کے سوال پر آیا تو عسرت کی شکایت کرتے ہوئے تیس روپیہ ماہوار کا خرچ گھر کا بتایا۔ اور قائل ہوکر کہا کہ اگر کم وبیش کسی روزگار میں اتنی کمائی ہوجائے کہ تنگی تُرشی سے بھی گھر کا خرچ چل جائے تو فقیری چھوڑنے کو ابھی تیار ہیں۔

اب میں اپنے دوست کی طرف دیکھتا ہوں اور وہ میری طرف۔ پھر معلوم ہوا کہ حضرت دوپہر کے قیلولہ کے سخت عادی ہیں، اور کسی صورت میں بھی دوپہر میں تو کام کر ہی نہیں سکتے۔ ویسے ہر طرح کوئی پیشہ، دھندا، نوکری، غرض جو بھی بتاؤ اس کے لیے حاضر ہیں۔ اب آپ ہی بتایئے میں اس کو کیا جواب دیتا۔ میرا وہ حال کہ مرے پر سَو دُرّے۔ اِتنے میں ملازم آیا۔ باوجود سخت تلاش کے وہ محتاج نہ مِلا۔ اگر میرے دوست نہ ہوتے تو غالبًا میں اِس موذی سے ضرور کپڑے چھین لیتا۔ مگر میں نے اور ترکیب سوچی۔

میں نے قطعی طور پر فقیر صاحب سے کہا کہ ''میں تمھیں اِس حرام خوری کی سزا دیے بغیر ہرگز نہ جانے دوں گا۔ پچاس دفعہ کان پکڑ کر اُٹھو بیٹھو، اور خبردار جو پھر کبھی اِس طرف کا رُخ کیا۔''

فقیر نے غصّے کے شعلے میری آنکھوں میں دیکھے۔ ممکن ہے کہ یہی سوچا ہو کہ سوئیٹر اور قمیص دونوں بالکل ثابت ہیں، سودا پھر بھی بُرا نہیں، نہایت ہی خاموشی اور سادگی سے آپ نے ڈنڈا اور پیالہ اپنا ایک طرف رکھا، جھولی اور مالا اُتار کر رکھا اور تہمد اونچی کرکے کسنے لگا کہ میں نے ڈانٹا ''بدتمیز!'' اِس کے جواب میں وہ مجھے نہایت ہی مطمئن کرکے فرماتے ہیں ''نیچے جانگیا پہنے ہوں'' اور عذر کیا کہ اُٹھنے بیٹھنے میں تہمد مُخل ہوگی۔

لیکن میں چوں کہ سزا دینا چاہتا تھا، لہٰذا میں نے اِس کی بھی اِجازت دے دی۔ اب یہ حضرت ایک ہُنکار کے ساتھ بڑے زور سے ہُونہہ کرکے بغیر کان پکڑے ہوئے پہلوانوں کی طرح ایک سپاٹے کے ساتھ پاؤں سرکا کر بیٹھک لگا گئے۔

''بدتمیز، بے ہودہ'' میں نے جل کر کہا ''یاد رکھو، تمھیں پولیس کو دے دوں گا۔ کان پکڑ کر سیدھی طرح اُٹھو بیٹھو۔'' دو دفعہ ان کو میں نے کان پکڑوا کر اُٹھنا بیٹھنا بتایا۔ اور یہ حضرت سزا بھگتنے میں مشغول ہوگئے۔ یہ حضرت میری پُشت کی طرف تھے اور ہم دونوں دوست فقیروں کو بُرا بھلا کہنے میں مشغول ہوئے۔

ایک دم سے مجھے خیال آیا کہ ''کان پکڑی'' غالباً پچاس دفعہ ہو چکی ہے۔ مُڑ کر میں نے دیکھا، تو سُرعت کے ساتھ جاری تھی۔ میں نے پوچھا تو وہ بولا کہ ایک سو دس دفعہ کی۔ میں نے کہا ''بس، بس اب جاؤ! میں نے تو پچاس دفعہ کو کہا تھا، زیادہ کیوں کی؟''

وہ بولا ''صاحب! پانچ سو بیٹھکیں روز لگاتا ہوں، میں نے سوچا کہ اب بار بار کون کرتا پھرے۔ لاؤ یہیں پوری کرلوں۔''

''ارے!'' میں نے اِس کم بخت کو اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تُو پہلوانی کرتا ہے؟'' واللہ میں نے گویا اب اِس کو غور سے دیکھا، کان ٹوٹے ہوئے، سینہ اور شانہ اور پٹیں! خوب کسرتی بدن۔

جواب دیتے ہیں، ''ویسے نہیں کہتا، شہر کے جس پٹّھے سے جی چاہے لڑا لیجیے۔''

میں نے کہا ''کم بخت، جی میں تو یہی آتا ہے کہ تیرا اور اپنا سَر مِلا کر لڑا لوں۔''

''نکل یہاں سے ابھی۔ ابھی نکل — نکالو اِسے۔''

جلدی جلدی اُس نے اپنی جھولی وغیرہ اُٹھائی اور سیکڑوں دعائیں دیتا ہُوا چلا گیا اور کم بخت مجھے انتہا سے زیادہ پست اور شکست خوردہ حالت میں چھوڑ گیا۔

اِس مؤذی کا بخار میں نے اور فقیروں پر نکالا، کسی کو نہ دیا۔ ڈانٹ کر بھگا دیا کہ ایک عرصہ بعد کیا دیکھتا ہوں کہ کھڑے مُلازمہ سے بحث فرما رہے ہیں۔ وہ کہتی ہے کہ جاؤ آگے بڑھو، اور آپ فرماتے ہیں کہ ہمیں اِس گھر سے ہمیشہ مِلتا ہے۔ (لفظ ہمیشہ پر زور) اِدھر میں جو آیا تو فوراً مجھے اِس امر کی شہادت میں پیش کرتے ہیں اور ٹیپ کا بند ''اللہ بھلا کرے، کچھ سائیں کو بھی۔''

میں نے اُسے پکڑ لیا کہ آج تُجھے نہ چھوڑوں گا۔ صحیح عرض کرتا ہوں کہ اِس موذی سے کوئی مَن بھر لکڑیاں پھڑوائیں، چشم زدن میں پھاڑ پھاڑ کر برابر کیں اور میری کُرسی کے پاس آکر میرے پیر دابنا شروع کر دیے اور ''اللہ بھلا کرے۔''

''ارے کم بخت چھوڑ!'' میں نے بے تاب ہو کر کہا، کیوں کہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری پنڈلیاں کوئی لوہے کے شکنجے میں دھر کے داب رہا ہے۔

لکڑیوں کی پھڑوائی شاید دو آنے دیے۔ قمیص اور مانگنے لگا۔ وہ نہ دی تو بدمعاش کہتا ہے ''بھوکا ہوں۔''

—— عظیم بیگ چغتائی

سوالوں کے جواب لکھیے :

1۔ مصنف کو فقیروں سے کیوں بغض تھا؟

2۔ مصنف کو پہلے فقیر پر کیوں رحم آیا؟ پہلے فقیر کا حلیہ کیسا تھا؟

3۔ ہٹے کٹّے فقیر کو دیکھ کر مصنف کی کیا حالت ہوئی؟

4۔ مصنف نے جب فقیر کو نوکری کی پیش کش کی تو اس نے کیا تنخواہ مانگی اور کیوں؟

© NCERT
not to be republished

علی عباس حسینی

(1897 – 1969)

علی عباس حسینی اتر پردیش کے ضلع غازی پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پٹنہ میں ہوئی۔ الہ آباد سے بی۔اے اور لکھنؤ سے ایم۔اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ایل۔ٹی کی سند حاصل کرنے کے بعد ایک سرکاری اسکول میں اردو فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔

علی عباس حسینی نے شروع میں پریم چند سے متاثر ہوکر افسانے لکھے۔ ایسے افسانوں میں گاؤں کے معصوم اور سادہ لوح افراد کی خوب صورت عکاسی ملتی ہے۔ بعد میں ان کے افسانوں میں ایسے کردار نظر آتے ہیں جو نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار ہیں۔ علی عباس حسینی کو انسانی نفسیات پر عبور حاصل ہے۔ وہ کردار کی ذہنی تہوں کو آہستہ آہستہ کھولتے ہیں جس سے اس کی مکمل شخصیت سامنے آجاتی ہے۔ ان کے افسانوں میں واقعات کی طوالت تو ہے مگر پلاٹ میں جھول پیدا نہیں ہوتا۔ علی عباس حسینی کے افسانوں کی بڑی خوبی اُن کی زبان ہے۔ وہ عربی فارسی کے الفاظ سے حتی الامکان گریز کرتے ہیں۔

''آئی۔سی۔ایس''، ''باسی پھول''، ''میلہ گھومنی''، ''کچھ ہنسی نہیں ہے'' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ ''اردو ناول کی تاریخ اور تنقید'' ان کی تنقیدی کتاب ہے۔

© NCERT not to be republished

5019CH03

آئی۔سی۔ایس

وحید کا آئی۔سی۔ایس میں جانا بالکل داتا کی دین تھی۔ ایک غریب دیہاتی زمیندار کا لڑکا جو گیارہ بارہ برس کے سِن تک ایک چھوٹے مختصر اور تنگ کچّے مکان میں پلا ہو، جو گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ گلی ڈنڈا، کبڈی، گیڑی اور آنکھ مچولی کھیلنے میں لگا رہا ہو، جس نے لڑکوں کے ساتھ ہر بڑے سے بڑے درخت پر چڑھ جانے اور چھپ بیٹھنے میں مہارت حاصل کی ہو۔ جس نے سات برس کی عمر سے گائیں بھینسیں خود دوہی ہوں اور ان کا گوبر اپنے ہاتھ سے اٹھایا ہو۔ اور جس کے سب سے بڑے دوست چھوٹی اُمّت کے لوگ رہے ہوں۔ وہ آج آئی۔سی۔ایس پاس ہو اور ہیٹ کوٹ پہنے صاحب بنا، 'ول ٹم کیا مانگٹا اور ہم نہیں جانٹا' بولنے کا فخر حاصل کر لے۔ واقعی بخشش الٰہی تھی یا حضرت موسیٰ کے لیے سنا تھا۔ وحید کے معاملے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

ہم نے مانا کہ بارہ برس کے سِن سے اس کندۂ ناتراش کو ایک دوٗر کے عزیز نے رحم کھا کر اپنے پاس رکھا، خراد پر چڑھایا اور آدمی بنایا۔ مگر یہ سب رحمتِ باری اور فضلِ الٰہی تھا۔ اس نے اگر ان عزیز کے دل میں اولاد کی خواہش کے ساتھ ساتھ ان کی گود بھی اولاد سے بھری ہوتی تو پھر کیا ہوتا۔ اگر وحید کی فطرت میں اثر قبول کرنے کا مادہ نہ ہوتا، اچھے خاصے جانور سے بھلا مانس انسان بننے کی صلاحیت ودیعت نہ کی ہوتی تو وہ کاہے کو اسکول یا کالج ہی سے اپنے کپڑوں، اپنے فیشن، اپنی تہذیب، اپنے سلیقے اور اپنی ذہانت کے لیے مشہور ہوتا۔ پودے ایک زمین سے نکال کر دوسری زمین میں لگا دینے سے اپنی نوعیت اور جنس نہیں بدل دیتے، نیم آم نہیں بن جاتی، نہ گیندا گلاب ہو جاتا ہے۔

مگر یہاں وحید کے معاملے میں تو محمد پور کیا چھوٹا اور الہ آباد کیا ملا کہ ایسا معلوم ہوا کہ شخصیت ہی دوسری ہوگئی، جون بدل گئی، جس طرح اس نے محمد پور کے پھٹے پرانے کپڑے اُتارے اور الہ آباد کے نئے چمکتے بھڑکتے پہن لیے، اسی طرح اس کی وہ بارہ برس تک کی طبیعت، ضد، جھلاہٹ، شرارت، بھداپن، ہٹیلاپن، اکھڑپن، گنوارپن، بدتہذیبی، بداخلاقی، کج روی، یاوہ گوئی، دریدہ ذہنی، بے ہودہ گوئی، کم عقلی، بداطواری، دیرفہمی، بدشوقی اور موقع ناشناسی سب محمد پوری کپڑوں کے ساتھ اتر گئی اور اس کی جگہ الہ آبادی کپڑوں کے پہنتے ہی متانت، سنجیدگی، خودداری، وقار، زودفہمی، سگھڑاپا، جامہ زیبی، خوش مزاجی، معاملہ فہمی، سخن سنجی آگئی۔ ہمارا یہ اِدّعا نہیں کہ یہ فرق فوراً پیدا ہوگیا تھا یا واقعی ایک جگہ سے چھوٹتے، ایک گھر سے نکلتے اور دوسرے گھر میں داخل ہوتے ہی پیدا ہوگیا تھا۔

© NCERT not to be republished

نہیں، اس تبدیلی میں سال دو سال لگے تھے۔ مگر پھر بھی یہ ایسا سریع اور عظیم انقلاب تھا جسے کایا پلٹ ہو جانا کہتے ہیں۔

بہرنوع، مالک کی دین کہیے یا وحید کی فطری صلاحیت و قابلیت، ہوا ایسا ہی کہ وحید جس دن سے اسکول میں داخل ہوا اور جس دن تک وہ تعلیم پاتا رہا ہمیشہ اپنے درجے میں اوّل آیا۔ یہاں تک کہ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد آئی۔ سی۔ ایس بھی ایسے اچھے نمبروں سے پاس ہوا کہ نہ سعی و سفارش کی ضرورت ہوئی اور نہ خاندانی حقوق و خدمات گنانے پڑے۔ اور دو برس انگلستان میں مزید تعلیم و تجربہ حاصل کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ وہاں کے قیام کے دوران میں ریاست مہیدر پور کے ایک رکن خاص، صاحب زادہ شہاب الدین خاں سے ملاقات و راہ و رسم پیدا ہوئی اور اسی سلسلے میں ان کی صاحب زادی جہاں آرا بیگم سے بھی جو اس سال آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی۔ اے میں نمایاں حیثیت سے کامیاب ہوئی تھیں روز روز ملنے جلنے نے کشش پیدا کی۔ صاحب زادہ کی اجازت اور جہاں آرا بیگم کی پسندیدگی سے اس نے وہیں بیاہ رچایا اور نئی دلہن ساتھ لے کر ہندوستان پلٹا۔ چونکہ دل میں یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں افلاس اور دیہاتیت کا پول نہ کھل جائے۔ اس لیے ہندوستان میں پہنچتے اور دہلی حضور وائسرائے کے صدر دفتر میں تعیناتی کا درمیانی زمانہ ریاست مہیدر پور میں سسرال ہی میں بسر کیا اور گھر لکھ بھیجا کہ ''میں فی الحال مکان نہیں آسکتا لیکن برابر والد کے لیے خرچ بھیجتا رہوں گا۔ کسی کو میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

بوڑھا باپ دل مسوس کر، بوڑھی ماں رو دھو کر اور بھائی خفا ہو کر خاموش رہے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا گھر اس قابل نہیں کہ کوئی آئی۔ سی۔ ایس آکر قیام کرے، وہ اسے خوب سمجھتے تھے کہ ان کا جھونپڑا کسی بیگم بہو کو اتارنے کے لائق نہیں۔ انھوں نے ٹھنڈی سانسیں بھریں آسمان کو دیکھا اور چھاتی پر سل رکھ لی۔

غرض بیگم نے نہ اپنی سسرال دیکھی اور نہ ساس سُسر، جیٹھ، دیوروں سے ملنے کی نوبت آئی کہ وحید دہلی میں لاٹ صاحب کے دفتر میں کام کرنے لگا۔ وہاں کے مشاغل بڑے بڑے آدمیوں سے ملنا جلنا، راجگان، مہاراج اور والیان ملک کی پارٹیاں، ایٹ ہوم، ڈنر، سنیما، تھیٹر، کھیل تماشے، غرض دل چسپیوں میں نہ کسی کی کمی تھی اور نہ ان کی وجہ سے اتنی فرصت کہ نئے رشتہ داروں اور عزیزوں کی ذرا فکر کی جائے۔ مگر بیگم کے لیے یہ دل چسپیاں ہو سکتیں تھیں وحید کی ماں کے لیے نہیں۔ اس نے تو وحید کو جنا تھا، اس کی ماتا کو بھلا کیسے چین پڑتا۔ وہ بیٹے کو لکھتی رہی بس ایک نظر دکھا جانے کی خواہش تھی، بہو کے دیکھنے کی بھی بڑی تمنائیں تھیں۔ بیٹے کی شادی کے بارے میں بڑھیا نے نہ جانے کیا کیا سوچ رکھا تھا، اپنوں پرایوں میں بہت سی لڑکیاں دیکھ رکھی تھیں۔ مگر وہاں صاحب زادے خود ہی بیگم بیاہ لائے۔ شادی ایسے چپ چپاتے کر لی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور موقع بھی ہوتا تو پہنچتی کیسے۔ کالے کوسوں دور سمندر پار، انگلستان میں، پھر سسرال اپنے میل کی نہ جوڑ کی۔ وہاں روپیوں کی، عزت کی، شان و شوکت کی افراط تھی،

© NCERT not to be republished

یہاں افلاس و تنگ دستی، نکبت کی بہتات۔ بہو پڑھی لکھی آکسفورڈ کی تعلیم یافتہ، لاٹ صاحب، ہاتھ ملانے والی۔ ساس جاہل، دیہاتن اور پردہ میں بیٹھنے والی۔ اس سے ساس کی طرح پیش آنا، بہو بنا کر ملنا، ہاتھی سے گنّا کھانا تھا۔ مور کی طرح ناچنے کو جی تو ضرور چاہا تھا لیکن پاؤں کو دیکھ کر لاج بھی آتی تھی۔ صبر کی سل چھاتی پر رکھی۔ مگر یہ بوجھ اتنا بھاری تھا کہ پہلو میں درد ہونے لگا۔ اس بے چینی نے خط لکھنے پر مجبور کیا۔ پہلے تو لڑکے ہی کو لکھتی رہی۔ جب اُدھر سے برابر ٹالنے ہی والا جواب ملا تو پھر ایک دن حمیدہ نے چھوٹے لڑکے کو پاس بلایا اور دل کی ساری کہانی بیگم بہو کو لکھوا دی۔

بات چونکہ دل سے نکلی تھی اس لیے دل میں گھر کر گئی۔ بیگم بہو کو لفظ لفظ میں خلوص، سادگی اور سچائی کی عطر آگیں بوئے خوش آئی۔ وہ ہاتھ میں خط لیے بے ساختہ آئی۔سی۔ایس وحید کے دفتر میں گھس آئیں اور اس کے سامنے سے فائلیں کھینچ کر بولیں۔

"کیوں صاحب یہ آخر آج تک آپ نے مجھے میری سسرال کے لوگوں سے کیوں نہ ملایا" مسٹر وحید آئی۔سی۔ایس، بیگم کے اس طرح چیں بہ جبیں آنے سے یوں ہی گھبرائے تھے، اس غیر متوقع سوال نے انھیں کچھ ڈرا سا دیا۔ وہ ذرا اٹک اٹک کے بولے۔

"جب سے ہندوستان پلٹ کے آیا۔ تمھارے میکے گیا پھر وہاں سے ملازمت پر چلا آنا پڑا۔ یہاں کے کاموں میں کچھ اس طرح پھنس گیا کہ...."

وہ بات کاٹ کر بولیں کہ "ماں باپ اور بھائیوں سے بھی نہ مل سکے اور نہ بیوی کو ملا سکے۔" وحید کی ذہانت کام آئی، اس نے ذرا مسکرا کر کہا، "یہ آج دفعتاً آپ کو سسرال کیوں یاد آگئی، کیا کسی نے خط لکھا ہے؟"

بیگم بولیں "جی ہاں میں تو انسان ہوں ہی نہیں کہ مجھے کوئی فکر ہوتی۔ بار ہا آپ سے پوچھا آپ نے کہا کسی دن اطمینان سے باتیں ہوں گی تو بتاؤں گا۔ شاید آپ مجھے انسان نہیں سمجھتے یا اپنے گھر والوں کو جانور سمجھتے ہیں۔"

وحید نے ذرا متانت سے کہا "بھئی ہے تو یونہی کہ تم ان لوگوں سے مل کر کچھ خوش نہ ہوگی۔ نہ وہ کچھ باتیں کرنا جانیں نہ آداب و تہذیب سے واقف نہ ان کے رہنے سہنے کا طریقہ ہم لوگوں کا سا۔"

بیگم نے تلخ مسکراہٹ سے کہا، "اب آپ زیادہ ان کی تعریفیں بیان فرمانے کی زحمت نہ کیجیے۔ آج آپ کی والدہ کا خط آیا ہے۔ میں خود چل رہی ہوں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں گی۔"

وحید گھبرا گیا وہ جلدی سے بولا "ارے تم وہاں چلوگی محمد پور۔"

اس نے کہا کہ "ہاں ہاں کیا کوئی وہاں کٹکھنا کتا چھوٹا ہوا ہے کہ جاتے ہی مجھے کاٹ کھائے گا۔" اور یہ کہتی وہ اپنے کمرے

© NCERT not to be republished

میں چلی گئی۔

وحید دیر تک سناٹے میں رہا۔ جانتا تھا کہ گھر میں رہنے کی جگہ مشکل سے نکل سکے گی۔ بیگم مصر تھیں کہ میں ضرور جاؤں گی، کہاں قیام ہوگا، کیا انتظام، پھر جتنی ادھر تعلیم و شائستگی، تہذیب و مدنیت تھی اتنی ہی اُدھر جہالت، غیر شائستگی اور دیہاتیت۔ خدا جانے بڑی بی نے کیا لکھوا دیا ہے کہ بیگم پر اس قدر اثر ہوا۔ آج تو پوری تریاہٹ کا مزہ آ گیا۔ اس نے جلدی سے خطوں کا کاغذ کھینچا باپ کو خط لکھا۔ اسی وقت بینک گھر گیا وہاں سے تین سو روپیوں کے نوٹ لیے ڈاک خانے سے رجسٹری لفافہ منگا کر بیمہ کر دیا۔ خط میں لکھا ''فوراً خانہ باغ کے احاطے میں گموس کے کھمبے جڑوا کے ان پر بنگلہ نما پھوس کا چھپر ڈلوا دیجیے اور معمولی ٹٹروں کی دیواریں کھینچ کر اس کے اندرونی حصّے میں کئی کمرے بنوا دیجیے۔ بیگم آپ لوگوں سے ملنے آ رہی ہیں۔ بس کوئی پندرہ دن میں ہم لوگ پہنچ جائیں گے۔ صحیح تاریخ سے بعد میں اطلاع دوں گا۔''

جب بیمہ لگا چکا تو وحید نے اطمینان کی سانس لی۔ اب بہت کچھ ذمے داری اس کے سر سے ہٹ چکی تھی۔ اب بس اتنی سی بات رہ گئی تھی کہ بیگم کو چھٹی نہ ملنے کا بہانہ کر کے پندرہ دن اور روکنا تھا۔ اس امر میں زیادہ دقت بھی نہ ہوئی اس لیے کہ بیگم نے سسرال چلنے کا قطعی فیصلہ سناتے ہی وہاں جانے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ متواتر کئی راتوں اور کئی دن وحید کو اپنے بڑے بھائیوں اور ان کی بیویوں کے نام اور حلیے، اُن کے بچوں کی تعداد، بہنوں اور ان کے شوہروں کے نام، ان کی صورت شکل، بن بیاہے بھائی کی عمر، لیاقت، مزاج، طبیعت، قد و قامت، بڑے میاں اور بڑی بی کی پسند کی چیزیں سب بتانا پڑیں۔ بیگم بات اور بات کی جڑ سب کچھ کھود کھود کر پوچھتی تھیں۔ بعض وقت ان کے سوالات کا جواب دیتے دیتے عاجز آ جاتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ بیگم کی اس غیر معمولی دل چسپی لینے کا نفسیاتی اثر ان پر بھی شروع ہوا۔ سفید رنگ کا خون بدلنے لگا۔ فطرت میں جو اپنوں سے اپنے ماں، باپ، بھائی بہن سے ہمدردی و محبت تھی اور جو آئی۔ سی۔ ایس کے مخملی پردوں سے ڈھک گئی تھی جس پر انگلستان اور ہندوستانی سکریٹریٹ کے ماحول نے ایک نیا ملمع چڑھا دیا تھا۔ بیگم کی کرید نے اس ملمع کو گھس ڈالا۔ بار بار کے سوال و جواب سے ملمع اتر گیا۔ خلوص و یگانگت جگہ جگہ سے جھلکنے لگی۔

خدا خدا کر کے وہ دن بھی آ گیا جس کا بیگم کو بے چینی سے انتظار تھا یعنی وحید کی پندرہ دن کی چھٹی منظور ہو گئی اور سفر کے لیے اسباب بندھنے لگا۔ بیگم نے جانے کیا سمجھا تھا کہ دس بارہ ٹرنک اور سوٹ کیس کپڑوں سے بھر لیے تھے۔ وحید نے چلنے سے کچھ گھنٹے قبل اتفاق سے یہ سامان دیکھ لیا تھا۔ بڑی ردّ و کد کی، مگر بکسوں میں کمی نہ ہوئی اور سب کے سب موٹر کے علاوہ کرائے کی لاری پر لاد کر اسٹیشن پہنچائے گئے۔

© NCERT not to be republished

گاڑی چلی تو وحید کا پس وپیش پھر بڑھا۔ سوچ رہا تھا کہ خدا جانے گھر پر والدین نے بیگم کے لائق کوئی جگہ حسبِ ہدایت بنوائی بھی یا نہیں۔ بیگم کو ان دیہاتیوں کی باتیں پسند آئیں یا نہ آئیں۔ یا خود ان لوگوں کو بیگم کی بے پردگی بھائے یا نہ۔ وہ سب کے سب پرانے خیال کے، دقیانوسی مراسم کے پابند، رئیسوں، امیروں کا طور طریقہ، انگلستان و یورپ کی تعلیم وتربیت، دیکھیے جوڑ کیسے بیٹھتا ہے اور آپس میں کیسے نبھتی ہے۔ آگ اور برف کا تال میل بیٹھے نہ بیٹھے۔ یہ جدھر بھی نظر کرتا، جس پہلو پر غور کرتا دشواریاں ہی دشواریاں دکھائی دیتیں۔ جی چاہتا بیگم کو سمجھائیں۔ ان کو اس سفر کے نشیب وفراز سمجھائیں۔

مگر بیگم کی یہ حالت تھی کہ انھوں نے ابتدائے سفر سے ایک ناول شروع کیا تو راستے بھر اسی کو پڑھتی رہیں۔ سفر طویل تھا۔ ایک دن اور ایک رات گاڑی پر دونوں رہے مگر سوائے کھانا کھانے کے اوقات کے کسی وقت باتیں کرنے کا موقع نہ ملا۔ ایک تو فرسٹ کلاس میں ہونے کی وجہ سے دونوں کے برتھ کافی فاصلے پر تھے، دوسرے ان کے برتھ کے اوپر والے حصّے پر ایک انگریز دراز تھا۔ ایسی حالت میں نجی اور خانگی گفتگو ناممکن ہی نہیں بلکہ محال تھی۔ کھانے کی میز پر رستوران کار میں اس کا موقع نہ تھا۔ پاس ہی پاس مختلف میزوں پر دوسرے لوگ بھی بیٹھے تھے، کس طرح یہ مسئلہ چھیڑ سکتا تھا؟ غرض محمد پور کا اسٹیشن آگیا اور یہ بیگم صاحبہ سے کچھ کہہ نہ سکے۔

وہاں اسٹیشن پر جو گاڑی رُکی تو چھوٹا بھائی مع پینس اور آٹھ کہاروں کے دکھائی دیا۔ وحید نے بیگم سے جلدی سے کہا ''یہاں شاید تمھیں پردہ کرنا پڑے۔''

انھوں نے کہا کہ میں پہلے ہی سے اس کے لیے تیار ہوں اور یہ کہتے ہی بکس کھول کر برقعہ نکال کر پہن لیا۔ وحید کو اس کی خبر بھی نہ تھی کہ وہ اتنا انتظام کیے بیٹھی ہیں اس لیے اسے بہت ہی تعجب ہوا، مگر چھوٹے بھائی کی گھبرائی ہوئی صورت اور اسٹیشن پر گاڑی زیادہ نہ رُکنے کے خیال نے گفتگو کا موقع نہ دیا۔ ڈبے کے سامنے پینس لگتے ہی بیگم اس میں جلدی سے سوار کروائی گئیں اور یہ مع اپنے بھائی کے بیل گاڑی پر اسباب لدوانے کے احکام صادر کرکے گھر کے تانگے پر بیٹھ کر روانہ ہوا۔

حمید اس کا بھائی اس سے پانچ برس چھوٹا تھا۔ اس نے قصبے کے ورنا کیولر اسکول سے اردو مڈل پاس کرکے تعلیم چھوڑ دی تھی اور کاشت کاری میں باپ کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ اس لیے اس میں نہ تو وہ کلچر تھا جو ایک تعلیم یافتہ شخص میں پایا جاتا ہے اور نہ اس میں وہ تہذیب وشائستگی تھی جو شہروں میں رہنے اور اچھی سوسائٹی میں ملنے جلنے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ایک ناتراشیدہ اور ناصاف کردہ ہیرا تھا۔ اس پر اب تک میل چڑھا ہوا تھا۔ مگر اس دیہاتیت اور بھدّے پن میں خلوص کی آب وتاب ماند نہ ہوئی تھی۔ وہ تانگا خود ہی ہنکاتا جاتا تھا اور بھائی سے بہت ہی بے تکلفی سے باتیں کرتا جاتا تھا۔ اور موقع موقع سے بھائی کے آئی۔سی۔ایس شہری اور رئیس

© NCERT not to be republished

ہونے پر طعن بھی کرتا جاتا تھا۔ غرض اس کی باتوں نے، بچپن کے مانوس مناظر نے، وطن کے سرسبز درختوں نے اور قصبے کے ہرے بھرے کھیتوں نے وحید پر آہستہ آہستہ اثر کرنا شروع کیا۔ وہ سب سے پہلے تو یہ بھولا کہ وہ آئی۔سی۔ایس ہے۔ پھر یہ بھولا کہ وہ بیگم سی تعلیم یافتہ رئیسہ کا شوہر ہے۔ پھر یہ بھولا کہ اس کی ہندوستان کے بڑے بڑے راجگان، مہاراجگان سے ملاقات ہے۔ پھر یہ بھولا کہ وہ ایک تعلیم یافتہ مہذب انسان ہے۔ وہ کیا کرتا۔ جن حصوں سے وہ گزر رہا تھا ان کا ایک ایک ذرّہ، ایک ایک چپّہ، ایک ایک بوٹا اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ وہی زمین جس پر وہ کبھی ننگے پاؤں دوڑا تھا، وہی کھیت جن میں اس نے اپنے ہاتھ سے مٹر اور چنا بویا تھا، وہی درخت جن کی شاخوں پر جلد سے جلد چڑھ جانے کے مقابلے میں وہ جیتا تھا، وہی چڑیاں جن کے بچّے پکڑ لانے کے لیے وہ قصبے بھر میں مشہور تھا۔ یہ ساری چیزیں اس کا خیر مقدم کر رہی تھیں اور اپنے اپنے طور پر دل کی گہرائیوں میں اپنے اپنے گرے پڑے گھروں کو کرید کرید کر اپنے بیٹھنے کی جگہیں بنا رہی تھیں۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ سرسبز درخت لہلہا رہے تھے۔ ہرے کھیت آنکھوں کو تراوٹ پہنچا رہے تھے اور سوندھی سوندھی مٹی کی بو مشامِ جاں کو معطر کیے دیتی تھی کہ اتنے میں مکان کی کچی دیوار دکھائی دی۔ معلوم ہوا جیسے روح کی گردن میں پھندا ڈال کر کسی نے کھینچنا شروع کیا۔ چھوٹے بھائی نے بھی گھوڑے کو چابک رسید کی۔ وہ پہلے ہی گھر دیکھتے ہی ہنہنا کے قدم بڑھا چکا تھا۔ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ وحید کا دم اس طرح پھول رہا تھا جیسے گھوڑے کی جگہ وہ خود اس دوڑ میں شریک ہو۔ عجب نہیں کہ اس کی نظر کے تار پر اس کی روح دوڑ رہی ہو۔

بارے گھر آیا۔ سامنے بڑے میاں دکھائی دیے۔ گھر پر سوائے کرتے پائجامے سلیپر کے کچھ نہ پہنتے تھے مگر آج خلافِ معمول شیروانی بھی پہنے تھے اور بوٹ بھی۔ غالباً آئی۔سی۔ایس اور تعلیم یافتہ بیگم بہو کی خاطر یہ زحمت انگیز کی تھی۔ وحید نے تانگے سے اُتر کر تسلیم کی۔ انھوں نے آب دیدہ ہو کر گلے سے لگا لیا۔ باہری مکان میں قصبے کے اور بھی عمائد موجود تھے۔ ایسے بھی تھے جنھوں نے بچپن میں اس کی گوشمالی کی تھی اور ایسے بھی جو اس کے ساتھ بہت سی شرارتوں میں شریک رہتے تھے۔ سب بڑی محبت سے ملے۔ بڑے میاں نے کہا ”گھر میں اس وقت جانے کا موقع نہیں ہے۔ وہاں دلہن اتارنے کے لیے ساری برادری کی عورتیں جمع ہیں۔ آؤ تمھیں نئے مکان میں پہنچا دیں۔ اسے دیکھ لو اور نہا دھو کر کپڑے بدل ڈالو پھر باتیں ہوں“ یہ کہہ کر خانہ باغ میں لے گئے۔ وہاں وحید کے حسبِ خواہش پختہ کھمبوں پر ایک بنگلہ نما چھپّر ڈال دیا گیا تھا۔ بیچ میں سبز کپڑے تان تان کے مختلف دیواریں بنا دی گئی تھیں۔ یعنی اچھا خاصا صاحب کے ڈرائنگ روم، ڈریسنگ روم، سلیپنگ روم، ڈائننگ روم اور کچھ مخصوص کمرے بیگم صاحبہ کے لیے تیار تھے۔ پلنگ، کرسیاں، فرش سب چیزیں سلیقے سے لگی تھیں۔

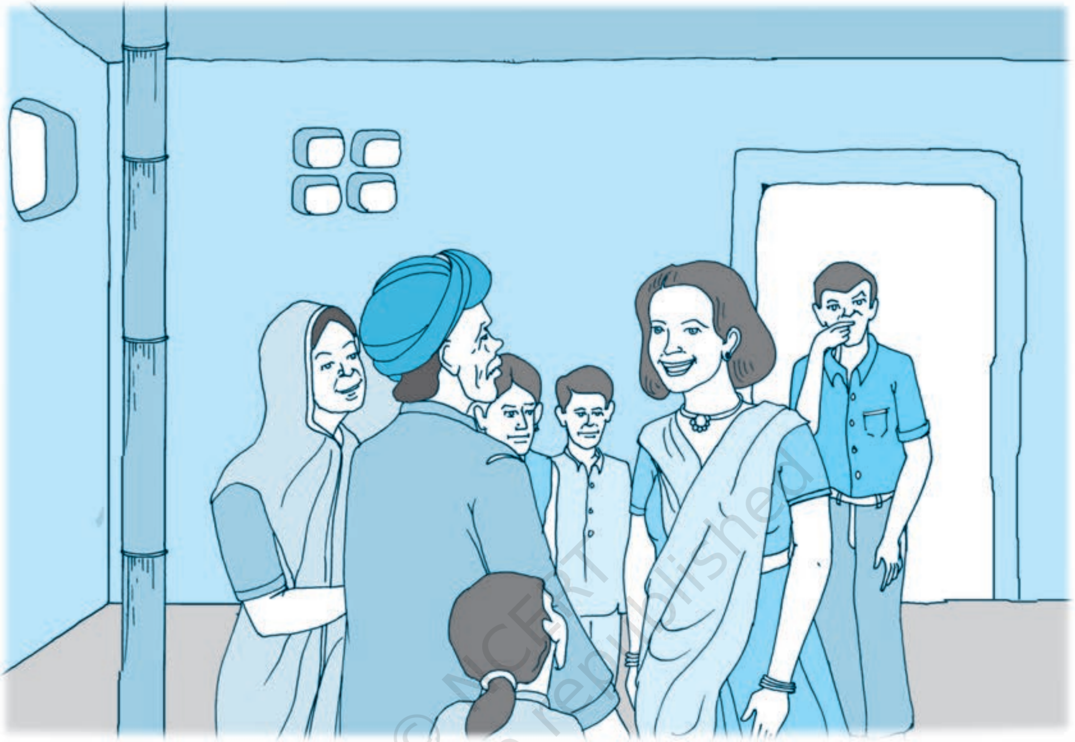

وحید حیرت سے اپنے والد کا منھ دیکھ کر بولا ''یہ سب سامان کس نے اتنے سلیقے سے لگا ڈالا؟'' انھوں نے حمید کی طرف اشارہ کر کے کہا ''جس دن سے تمھارا خط آیا ہے، بس یہ انھیں کاموں میں لگا رہا۔ پھر گاؤں بھر کے تمام جوان ساتھ تھے۔ ان ہی سبھوں نے مل کر یہ سب درست کیا ہے۔ نہ دن کو دن سمجھا ہے نہ رات کو رات۔''

وحید نے بھائی کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ وہ بولا ''ہم دیہاتیوں کے ہاں صاحب مع میم صاحبہ کے تشریف لا رہے تھے۔ پھر ہم اتنا بھی نہ کرتے۔ آئی۔سی۔ایس جو لوگ ہوتے ہیں، ان کے ہاتھ پاؤں نازک، ان کے دل و دماغ نازک ہوتے ہیں۔ اب اگر آپ ہمارے موٹے بھدّے اور بدشکل پلنگ استعمال کرتے تو آپ کو تکلیف نہ ہوتی؟''

وحید نے مسکرا کر کہا ''ہوں، تو تم سمجھتے ہو، ہم لوگ بالکل نازک ہوتے ہیں، کیوں؟''

وہ بولا ''اور کیا؟ کیا آپ میرے ساتھ کھیت گوڑ سکتے ہیں، ہل چلا سکتے ہیں؟ پانچ منٹ میں بھاگ نکلیے گا۔''

وحید نے کہا ''اچھا ذرا میں نہا لوں تو تم کو بتاتا ہوں۔''

اس نے کہا ''بہت اچھا آج ہی شام کو بھابی کے سامنے!''

© NCERT not to be republished

بیگم کا اندر کیا رِسپشن ہوا۔ کس کس طرح کی رسمیں کی گئیں۔ بیبیوں نے کیا کیا فقرے کسے، کس کو پسند آئیں، خود ان پر کیا گزری اور ان کے ساتھ ماما دائیوں نے کیا رائے قائم کی۔ یہ سب تمام باتیں بیان کرنا اس مختصر افسانے میں ممکن نہیں۔ اس کے لیے ایک پورے ناول کی ضرورت ہے۔ ہاں اتنا ظاہر ہیں آنکھیں بھی دیکھ سکتی تھیں کہ تمام وہ احکام جو ساس نے نافذ کیے وہ خوشی خوشی بجا لائیں۔ یہاں تک کہ بڑی بی نے اپنے دیہاتی لب ولہجہ میں خود کہا کہ ''اللہ تمھیں مانگ کوکھ سے ٹھنڈا رکھے تم نے میرا دل خوش کر دیا۔ مجھے بڑے بڑے وسواس تھے مگر مجھے ایسا جان پڑتا ہے کہ میں دن میں چراغ لے کر ڈھونڈتی تو ایسی بہو نہ مل سکتی تھی۔'' نندوں نے اس پر خوب خوب فقرے کسے۔ مگر بڑی نندوں نے چھوٹیوں کو ڈانٹا، اور انھیں اپنے ساتھ اٹھا کر خانہ باغ والے مکان میں پہنچا آئیں۔ شام کو جب اعزا اور برادری کے لوگ جا چکے تو سارا گھر نئی بہو کے پاس سمٹ کر آ گیا۔ بڑے میاں رونمائی کے لیے بلائے گئے اور بیوی کو ایک بھدیسل سونے کا زیور دے کر بہو کے پاس کرسی پر بیٹھ گئے۔ بڑی بی نے کہا ''وحید کو بھی بلا لو، اب سب رسمیں ہو گئیں۔ اب خواہ مخواہ کی شرم بے کار ہے۔'' وحید و حمید بھی آ ئے۔ بیگم نے اپنی ایک بوڑھی ماما کی طرف دیکھا۔ اس نے خوان پر خوان لگانا شروع کیے۔ کسی میں بڑی بھاوج کے لیے جوڑا نکلا تو کسی میں نندوں کے لیے۔ تہذیب یہ کہ جس کا جوڑا ہوتا اس کے سامنے خوان لے کر خود بیگم جاتیں اور خوان رکھ کر اس طرح مؤدب کھڑی رہتیں جیسے معلوم ہوتا کوئی پجارن کسی دیوی کے سامنے بھینٹ چڑھا رہی ہے۔

میاں حمید پہلو بدل رہے تھے کہ عورتوں کو سب کچھ ملا مگر مجھ غریب کو کچھ بھی نہیں کہ اتنے میں ایک اور خوان آیا، بیگم وہ لے کر اس کی طرف بڑھیں۔ اس نے جلدی سے بڑھ کر خوان سنبھال کر رکھا۔ خود خوان پوش ہٹا کر دیکھا، خوان میں شیروانیوں اور قمیصوں کے کپڑے اور کئی پائجامے سلے ہوئے رکھے تھے۔ ان کے ساتھ مختلف قسم کے رومال، موزے، عطر، سینٹ، کنگھا، تیل اور ایک آئینہ اور کچھ روپیے بھی رکھے تھے۔ حمید شرما گیا۔ بیگم نے آہستہ سے کہا ''بھیّا پاؤں اور سر کی ناپ نہ معلوم تھی اس لیے ٹوپی اور جوتا نہ خرید سکی۔ آپ اپنی پسند کا خرید لیجیے۔''

وہ ان چیزوں کو لیتے ہوئے جھجکا تو بڑے میاں نے کہا ''اخاہ! آج آپ بھی شرما رہے ہیں۔ ارے بے وقوف تو تو چھوٹا ہے۔ بندگی کر اور سب جلدی سے سمیٹ!''

اس نے جلدی سے بیگم کو تسلیم کی، روپیہ اٹھانا چاہا، ماں نے کہا ''اور بھائی کو تسلیم نہیں!''

وحید نے کہا، ''جی روپیے تو بیگم نے دیے ہیں اور کپڑے بھی انھیں نے۔ میرا خدا شاہد ہے کہ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ انھوں نے یہ سب سامان کب اور کیوں کر درست کیا۔''

سب نے بیگم کو بڑی محبت سے دیکھا۔ انھوں نے مسکرا کر سر جھکایا۔ سب سے آخر میں دو بڑے بڑے خوان آئے۔ بیگم نے ایک ساس کے سامنے رکھا ایک سسرے کے، دونوں طرح طرح کے کپڑوں اور چیزوں سے پُر تھے اور پھر لطف یہ کہ تمام چیزیں وہی جوان کی خاص پسند کی تھیں۔

وحید متعجب ہو کر بول اٹھا ''بھئی کمال کیا، یہ تمام سامان کر ڈالا اور میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔''

حمید نے کہا ''جی بھلا صاحب کو ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے کیا مطلب؟''

وحید اس پر جھپٹ پڑا۔ ''تو آج صبح سے بہت تیزیاں کر رہا ہے۔ سمجھ لیا کہ میں آئی۔سی۔ایس کیا ہوں کہ بالکل موم کا بن گیا ہوں کھڑا تو رہ!''

وہ ہنستا ہوا یہ کہہ کر بھاگا، ''اچھا مجھے پکڑ ہی لیجیے تو میں جانوں!''

دونوں بھائیوں میں دوڑ ہونے لگی۔ وہ بار بار جھکائیاں دے کر نکل جاتا مگر وحید برابر پیچھا کرتا رہا۔ یہاں تک کہ حمید یہ سمجھ کر کہ اب گرفتار ہو جاؤں گا ایک املی کے درخت پر چڑھنے لگا۔ جب وحید اس کے نیچے آ کر رک گیا تو وہ بولا ''آئی۔سی۔ایس صاحب! یہاں تشریف لائیے۔'' وحید نے بھی جوتے کے فیتے کھول ڈالے، اور ننگے پاؤں ہو کر درخت پر چڑھنا شروع کیا۔ املی کا درخت بہت بڑا تھا۔ حمید تو پہلے سب سے اونچی شاخ پر چڑھ گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ وحید اسی پر چلا آ رہا ہے تو جلدی سے وہ اس سے اُچک کر دوسری پر ہو رہا۔ مگر تابہ کے؟ وحید کی کم سنی کی مہارت کام آئی۔ اس نے بالآخر حمید کو پکڑ ہی لیا اور وہیں سے کان پکڑے نیچے اُتار لایا۔ حمید کے کھسیانے ہونے پر سارا گھر ہنستا رہا۔ مگر بیگم خاموش بیٹھی رہیں۔ وحید نے ان کی خاموشی سے ذرا سا اثر لیا۔ اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا تو ریشمی قمیص کئی جگہ سے پھٹ چکی تھی اور پتلون کی ساری کریز خاک میں مل گئی تھی۔ مگر اس وقت اس پر فضا اور ماحول کا پورا اثر ہو چکا تھا، اس نے کچھ زیادہ پروا نہ کی۔ سامنے بہت سے بانس کٹے ہوئے پڑے تھے۔ بھائی سے بولا ''یہ یہاں اچھے نہیں معلوم ہوتے چلو دوسرے حصّے میں پھینک آئیں۔ دیکھیں تو کتنی محنت کر سکتے ہو!''

بڑے میاں نے کہا ''نہیں بیٹا تم رہنے دو کل مزدور بلا کر ہٹا دیا جائے گا۔''

اس نے مسکرا کر کہا ''نہیں ابّا جان، یہ اپنے کو بڑا قوی سمجھنے لگا ہے آپ کے سامنے ہی آج فیصلہ ہو جائے گا۔''

یہ کہہ کر حمید کے ساتھ بانسوں کے اٹھانے پر پل پڑا۔

چشم زدن میں تقریباً سو بے چھلے بانس دونوں بھائیوں نے اُٹھا کر دوسرے حصّے میں منتقل کر دیے۔ دونوں پسینے میں شرابور مٹی سے اَٹے ہوئے کرسیوں کے پاس آ کر تھک کر بیٹھ گئے۔

© NCERT not to be republished

بڑی بی نے پوچھا ''حمید اب آئی۔سی۔ایس کے متعلق کیا رائے ہے؟''

اس نے اپنے میلے ہاتھ سے پیشانی کا پسینہ پوچھتے ہوئے کہا ''میری دانست میں ان سے بجائے حکومت کرنے کے مزدوروں کا کام لینا چاہیے، یہ بڑے مضبوط ہوتے ہیں۔''

سب لوگ ہنس ہی رہے تھے کہ بیگم ساس سسر کو سلام کر کے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

وحید کو بیگم کے جاتے ہی خیال آیا کہ اس نے اپنی دیہاتیت اور بربریت کا جس طرح مظاہرہ کیا ہے اس کے بعد اس کی کوئی وقعت بیگم کی نظروں میں باقی نہیں رہ سکتی۔ اسے حد درجہ خجالت اور شرمندگی محسوس ہونے لگی اور باپ کے یہ کہنے پر کہ ''جاؤ میاں وحید نہا کر کپڑے بدل ڈالو، اب یہ تو بالکل درختوں اور بانسوں کی نذر ہو چکے۔'' اس کی کیفیت میں اور اضافہ ہو گیا۔

وہ گردن جھکائے اس حصّے میں گیا جو حمام کرنے کے لیے مخصوص کر لیا گیا تھا اور اس نے نہا دھو کر جلدی جلدی کپڑے بدل ڈالے، پھر وہ شرمندہ اور منفعل اس کمرے میں گیا جو بیگم کے لیے مخصوص تھا۔ دیکھا تو وہ اپنے کمرے میں اس کی خاص پسند کی ساڑی پہنے کھڑکی کے سامنے ہیں۔ وحید کو ان کے انداز سے محسوس ہوا کہ بیگم اس کے افعال سے بے حد رنجیدہ ہیں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا، ''بیگم'' انھوں نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا وہ رک رک کر بولا، ''بیگم میں تم سے بہت شرمندہ ہوں مگر....... میں کیا کروں............ اس ماحول اور اس فضا نے....... مجھے انسانیت کا جامہ اُتارنے پر مجبور کیا۔''

انھوں نے کہا، ''انسانیت نہ کہیے آئی۔سی۔ایس کا جامہ کہیے۔''

—— علی عباس حسینی

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ آئی۔سی۔ایس بننے کے بعد وحید میں کیا تبدیلی آئی؟

2۔ گاؤں پہنچنے سے پہلے وحید کی کیا کیفیت تھی؟

3۔ ''پودے ایک زمین سے نکال کر دوسری زمین میں لگا دینے سے اپنی نوعیت اور جنس نہیں بدل دیتے۔'' اس فقرے کی وضاحت کیجیے۔

4۔ بہو بیگم کے کردار کی خوبیاں بیان کیجیے۔

© NCERT not to be republished

کرشن چندر

(1914 – 1977)

کرشن چندر وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم پونچھ (جموں و کشمیر) میں ہوئی۔ 1930 کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور آ گئے۔ فورمین کرسچین کالج میں داخلہ لے لیا۔ 1934 میں پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔ اے کیا۔ اسی زمانے میں کرشن چندر کو آل انڈیا ریڈیو، لاہور میں ملازمت مل گئی۔ اس سلسلے میں انھوں نے کچھ وقت دہلی اور لکھنؤ میں بھی گزارا۔ اس کے بعد ان کا تعلق فلمی دنیا سے ہو گیا اور وہ اپنے آخری وقت تک ممبئی میں رہے۔ ممبئی ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ پریم چند کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اُردو افسانے کو نئی بلندیوں تک پہنچایا، ان میں بیدی، منٹو، عصمت چغتائی اور کرشن چندر کے نام ممتاز ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ اس تعلق کا اثر ان کی کہانیوں اور ناولوں میں بہت نمایاں ہے۔

کرشن چندر نے ناول، افسانے، ڈرامے، رپورتاژ اور مضامین لکھے ہیں لیکن ان کی بنیادی حیثیت افسانہ نگار کی ہے۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں کشمیر کی کہانیاں، طلسم خیال، زندگی کے موڑ پر، ان داتا، مہالکشمی کا پل، پشاور ایکسپریس اور ناولوں میں ''شکست''، ''جب کھیت جاگے''، ''باون پتّے'' اور ''آسمان روشن ہے'' قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی تحریروں کی مقبولیت کا اہم سبب ان کی رومانیت اور ان کا خوب صورت اندازِ بیان ہے۔ کرشن چندر نے بچوں کے لیے ''چڑیوں کی الف لیلہ'' اور ''الٹا درخت'' لکھا ہے۔ ان کی طنزیہ تحریروں میں ''ایک گدھے کی سرگزشت'' کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

© NCERT not to be republished

5019CH04

دو فرلانگ لمبی سڑک

کچہریوں سے لے کر کالج تک بس یہی کوئی دو فرلانگ لمبی سڑک ہوگی، ہر روز مجھے اسی سڑک پر سے گزرنا ہوتا ہے، کبھی پیدل، کبھی سائیکل پر۔ سڑک کے دورویہ شیشم کے سوکھے سوکھے اُداس سے درخت کھڑے ہیں۔ ان میں نہ حُسن ہے نہ چھاؤں، سخت کھردرے تنے اور ٹہنیوں پر گِدھوں کے جھنڈ، سڑک صاف سیدھی اور سخت ہے۔ متواتر نو سال سے میں اس پر چل رہا ہوں، نہ اس میں کبھی کوئی گڑھا دیکھا ہے، نہ شگاف، سخت پتھروں کو کوٹ کوٹ کر یہ سڑک تیار کی گئی ہے۔ اور اب اس پر کول تار بھی بچھی ہے، جس کی عجیب سی بُو گرمیوں میں طبیعت کو پریشان کر دیتی ہے۔

© NCERT not to be republished

سڑکیں تو میں نے بہت دیکھی بھالی ہیں، لمبی لمبی، چوڑی چوڑی سڑکیں، بُرادے سے ڈھنپی ہوئی سڑکیں، سڑکیں جن پر سرخ بجری بچھی ہوئی تھی، سڑکیں جن کے گرد سرو و شمشاد کے درخت کھڑے تھے، سڑکیں — مگر نام گنانے سے کیا فائدہ اس طرح تو اَن گنت سڑکیں دیکھی ہوں گی۔ لیکن جتنی اچھی طرح میں اس سڑک کو جانتا ہوں کسی اپنے گہرے دوست کو بھی اتنی اچھی طرح نہیں جانتا۔ متواتر نو سال سے اسے جانتا ہوں اور ہر صبح اپنے گھر سے جو کچہریوں سے قریب ہی ہے، اُٹھ کر دفتر جاتا ہوں جو لا کالج کے پاس واقع ہے۔ بس یہی دوفرلانگ کی سڑک، ہر صبح اور ہر شام، کچہریوں سے لے کر لا کالج کے آخری دروازے تک، کبھی سائیکل پر کبھی پیدل۔

اس کا رنگ کبھی نہیں بدلتا، اس کی ہیئت میں تبدیلی نہیں آتی۔ اس کی صورت میں روکھا پن بدستور موجود ہے۔ جیسے کہہ رہی ہو، مجھے کسی کی کیا پروا۔ اور یہ ہے بھی سچ۔ اسے کسی کی پروا کیوں ہو؟ سینکڑوں ہزاروں انسان، گھوڑے گاڑیاں، موٹریں اس پر سے ہر روز گزر جاتی ہیں اور پیچھے کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ اس کی ہلکی نیلی اور سانولی سطح اسی طرح سخت اور سنگلاخ ہے جیسے پہلے روز تھی، جب ایک یوریشین ٹھیکیدار نے اسے بنایا تھا۔

یہ کیا سوچتی ہے؟ یا شاید یہ سوچتی ہی نہیں، میرے سامنے ہی ان نو سالوں میں اس نے کیا واقعات، حادثے دیکھے۔ ہر روز ہر لحہ کیا نئے تماشے نہیں دیکھتی، لیکن کسی نے اسے مسکراتے نہیں دیکھا، نہ روتے ہی۔ اس کی پتھریلی چھاتی میں کبھی ایک درز بھی پیدا نہیں ہوئی۔

''ہائے بابو، اندھے محتاج، غریب فقیر پر ترس کھاؤ۔ ارے بابا، اے بابو، خدا کے لیے ایک پیسہ دیتے جاؤ۔ ارے بابا، ارے کوئی بھگوان کا پیارا نہیں، صاحب جی میرے ننھے ننھے بچّے بِلک رہے ہیں، ارے کوئی تو ترس کھاؤ ان یتیموں پر۔''

بیسیوں گداگر اسی سڑک کے کنارے بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی اندھا ہے، تو کوئی لُنجا، کسی کی ٹانگ پر ایک خطرناک زخم ہے تو کوئی غریب عورت دو تین چھوٹے چھوٹے بچّے گود میں لیے حسرت بھری نگاہوں سے راہ گیروں کی طرف دیکھتی جاتی ہے۔ کوئی پیسہ دے دیتا ہے، کوئی تیوری چڑھائے گزر جاتا ہے۔ کوئی گالیاں دے رہا ہے، حرام زادے مُشٹنڈے، کام نہیں کرتے۔ بھیک مانگتے ہیں۔

کام، بے کاری، بھیک۔

دولڑکے سائیکل پر سوار ہنستے ہوئے جا رہے ہیں، ایک بوڑھا امیر آدمی اپنی شاندار فٹن میں بیٹھا سڑک پر بیٹھی ہوئی بھکارن کی طرف دیکھ رہا ہے، اور اپنی انگلیوں سے مونچھوں کو تاؤ دے رہا ہے۔ ایک سست مضحمل کتّا فٹن کے پہیوں تلے آ گیا ہے۔ اس کی

© NCERT not to be republished

پسلی کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔لہو بہہ رہا ہے۔اس کی آنکھوں کی افسردگی، بے چارگی، اس کی ہلکی ہلکی دردناک ٹیاؤں ٹیاؤں کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرسکتی۔ بوڑھا آدمی اب گدیلوں پر جھکا ہوا اس عورت کی طرف دیکھ رہا ہے جو ایک خوش نما سیاہ رنگ کی ساڑی زیب تن کیے اپنے نوکر کے ساتھ مسکراتی ہوئی باتیں کرتی جارہی ہے۔اس کی سیاہ ساڑی کا نُقرئی حاشیہ بوڑھے کی حریص آنکھوں میں چاندی کی کرن کی طرح چمک رہا ہے۔

پھر کبھی سڑک سُنسان ہوتی ہے۔صرف ایک جگہ شیشم کے درخت کی چھدری چھاؤں میں ایک ٹانگے والا گھوڑے کو سُستا رہا ہے۔گِدھ دھوپ میں ٹہنیوں پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں، پولیس کا سپاہی آتا ہے۔ایک زور کی سیٹی۔ او تانگے والے! یہاں کھڑا کیا کررہا ہے؟ کیا نام ہے تیرا، کردوں چالان؟ ہجور۔ ہجور کا بچّہ! چل تھانے۔ ہجور؟ یہ تھوڑا ہے، اچھا جا تجھے معاف کیا۔

تانگے والا تانگے کو سرپٹ دوڑائے جارہا ہے۔راستے میں ایک ''گورا'' آرہا ہے۔سر پر ٹیڑھی ٹوپی ہاتھ میں بید کی چھڑی، رخساروں پر پسینہ، لبوں پر کسی ڈانس کا سُر۔

''کھڑا کردو، کنٹونمنٹ''

''آٹھ آنے صاحب''

''ول، چھ آنے''

''نہیں صاحب''

''کیا بکتا ہے، ٹم......''

تانگے والے کو مارتے مارتے بید کی چھڑی ٹوٹ جاتی ہے، پھر تانگے والے کا چمڑے کا ہنٹر کام آتا ہے۔لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں، پولیس کا سپاہی بھی پہنچ گیا ہے۔حرام زادے، صاحب بہادر سے معافی مانگو، تانگے والا اپنی میلی پگڑی کے گوشے سے آنسو پونچھ رہا ہے۔لوگ منتشر ہوجاتے ہیں۔

اب سڑک پھر سُنسان ہے۔

شام کے دُھندلکے میں بجلی کے قمقمے روشن ہوگئے۔ میں نے دیکھا کہ کچہریوں کے قریب چند مزدور بال بکھرے، میلے لباس پہنے باتیں کررہے ہیں۔

''بھیّا بھرتی ہوگیا''

''ہاں''

© NCERT not to be republished

''تنخواہ تو اچھی ملتی ہوگی''

''ہاں''

''بڑھوٗ کے لیے کما لائے گا۔ پہلی بیوی تو ایک ہی پھٹی ساڑی میں رہتی تھی۔''

''سنا ہے، جنگ سُروع (شروع) ہونے والی ہے''

''کب سُروع ہوگی؟''

''کب؟ اس کا پتہ نہیں، مگر ہم گریب (غریب) ہی تو مارے جائیں گے''

''کون جانے گریب مارے جائیں گے کہ امیر''

''نَنھا کیسا ہے؟''

''بخار نہیں ٹلتا، کیا کریں، اِدھر جیب میں پیسے نہیں ہیں اُدھر حکیم سے دوا....''

''بھرتی ہو جاؤ''

''سوچ رہے ہیں''

''رام رام''

''رام رام''

پھٹی ہوئی دھوتیاں، ننگے پاؤں، تھکے ہوئے قدم، یہ کیسے لوگ ہیں۔ یہ نہ تو آزادی چاہتے ہیں نہ حُریّت۔ یہ کیسی عجیب باتیں ہیں، پیٹ، بھوک، بیماری، پیسے قمقموں کی زرد زرد روشنی سڑک پر پڑ رہی ہے۔

دو عورتیں، ایک بوڑھی ایک جوان، اُپلوں کے ٹوکرے اٹھائے خچّروں کی طرح ہانپتی ہوئی گزر رہی ہیں۔ جوان عورت کی چال تیز ہے۔

''بیٹی ذرا ٹھہر تو۔'' بوڑھی عورت کے چہرے پر بے شمار جُھرّیاں ہیں۔ اس کی چال مدھم ہے۔ اس کے لہجے میں بے کسی ہے۔

''بیٹی، ذرا ٹھہر، میں تھک گئی...... میرے اللہ!''

''اماں، ابھی گھر جا کر روٹی پکانی ہے، تُو تو باولی ہوئی ہے۔''

''اچھا بیٹی، اچھا بیٹی''

© NCERT not to be republished

بوڑھی عورت جوان عورت کے پیچھے بھاگتی ہوئی جارہی ہے۔ بوجھ کے مارے اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اس کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں۔

وہ صدیوں سے اسی سڑک پر چل رہی ہے، اُپلوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے۔ کوئی اس کا بوجھ ہلکا نہیں کرتا، کوئی اسے ایک لمحہ سُستانے نہیں دیتا، وہ بھاگی ہوئی جارہی ہے، اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اس کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں۔ اس کی جُھریوں میں غم ہے......اور بھوک......اور فکر......اور غلامی......اور صدیوں کی غلامی۔

تین چار نوخیز لڑکیاں، بھڑکیلی ساڑیاں پہنے، باہوں میں باہیں ڈالے ہوئے جارہی ہیں۔

''بہن، آج شملہ پہاڑی کی سیر کریں''

''بہن، آج لارنس گارڈن چلیں''

''بہن، آج انارکلی''

''ریگل؟''

''شٹ اَپ، یوفُول''

آج سڑک پر سُرخ حلوان بچھا ہے، آر پار جھنڈیاں لگی ہوئی ہیں، جا بجا پولیس کے سپاہی کھڑے ہیں۔ کسی بڑے آدمی کی آمد ہے۔ جبھی تو اسکولوں کے چھوٹے چھوٹے لڑکے نیلی پگڑیاں باندھے سڑک پر دو رویہ قطاروں میں کھڑے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں ہیں۔ ان کے لبوں پر پپڑیاں جم گئی ہیں۔ ان کے چہرے دھوپ کی شدّت سے تمتما اٹھے ہیں۔ اسی طرح کھڑے کھڑے وہ ڈیڑھ گھنٹے سے بڑے آدمی کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب وہ پہلے پہل یہاں سڑک پر کھڑے ہوئے تھے تو ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ اب سب چُپ ہیں۔ چند لڑکے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے تھے۔ اب استاد انھیں کان پکڑ کر اٹھا رہے ہیں۔ شفیع کی پگڑی کھل گئی تھی، استاد اسے گھور کر کہہ رہا ہے'' او شفی! پگڑی ٹھیک کر۔'' پیارے لال کی شلوار اس کے پاؤں میں اٹک گئی ہے اور ازار بند جوتیوں تک لٹک رہا ہے۔ ''تمھیں کتنی بار سمجھایا ہے پیارے لال!''

''ماسٹر جی، پانی''

''پانی کہاں سے لاؤں، یہ بھی تم نے اپنا گھر سمجھ رکھا ہے۔ دو تین منٹ اور انتظار کرو، بس ابھی چُھٹّی ہُوا چاہتی ہے۔''

دو منٹ، تین منٹ، آدھ گھنٹہ۔

''ماسٹر جی، پانی''

© NCERT not to be republished

''ماسٹر جی، پانی''

''ماسٹر جی بڑی پیاس لگی ہے۔''

لیکن اُستاد اب اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے، وہ ادھر اُدھر دوڑتے پھر رہے ہیں۔''لڑکو ہوشیار ہوجاؤ۔ دیکھو جھنڈیاں اس طرح ہلانا، ابے تیری جھنڈی کہاں ہے؟ قطار سے باہر ہو جا، بدمعاش کہیں کا......سواری آ رہی ہے۔''

موٹر سائیکلوں کی پھٹ پھٹ، بینڈ کا شور، تِلّی اور چھوٹی جھنڈیاں بے دلی سے ہلتی ہوئیں۔ سوکھے ہوئے گلوں سے پژمردہ نعرے۔

بڑا آدمی سڑک سے گزر گیا، لڑکوں کی جان میں جان آ گئی ہے۔ اب وہ اُچھل اُچھل کر جھنڈیاں توڑ رہے ہیں، شور مچا رہے ہیں۔

خوانچے والوں کی صدائیں، ریوڑیاں، گرم گرم چنے، حلوہ پوری، نان، کباب۔

ایک خوانچے والا ایک طرّے والے بابو سے جھگڑ رہا ہے۔ مگر آپ نے میرا خوانچہ اُلٹ دیا۔ میں آپ کو نہیں جانے دوں گا۔ میرا تین روپے کا نقصان ہوگیا۔ میں غریب آدمی ہوں، میرا نقصان پورا کردیجیے تو میں جانے دوں گا۔

میونسپلٹی کا پانی والا چھکڑا آہستہ آہستہ سڑک پر چھڑکاؤ کر رہا ہے۔ چھکڑے کے آگے جُتے ہوئے دو بیلوں کی گردنوں پر زخم پیدا ہوگئے ہیں۔ چھکڑے والا سردی میں ٹھٹھرتا ہوا کوئی گیت گانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بیلوں کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ابھی سڑک کا کتنا حصّہ باقی ہے۔

سڑک کے کنارے ایک بوڑھا گداگر مرا پڑا ہے۔ اس کے میلے دانت ہونٹوں کے اندر دھنس گئے ہیں۔ اس کی کھلی ہوئی بے نور آنکھیں آسمان کی طرف تک رہی ہیں۔

''خدا کے لیے مجھ غریب پر ترس کر جاؤ رے بابا۔''

کوئی کسی پر ترس نہیں کرتا۔ سڑک خاموش اور سنسان ہے۔ یہ سب کچھ دیکھتی ہے، سنتی ہے، مگر ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ انسان کے دل کی طرح بے رحم، بے حس اور وحشی ہے۔

انتہائی غیظ وغضب کی حالت میں اکثر میں سوچتا ہوں کہ اگر اسے ڈائنامیٹ لگا کر اُڑا دیا جائے تو پھر کیا ہو۔ ایک بلند دھماکے کے ساتھ اس کے ٹکڑے فضا میں پرواز کرتے نظر آئیں گے۔ اس وقت مجھے کتنی مسرّت حاصل ہوگی، اس کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔ کبھی کبھی اس کی سطح پر چلتے چلتے میں پاگل سا ہو جاتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ اسی دم کپڑے پھاڑ کر ننگا سڑک پر ناچنے لگوں اور

© NCERT not to be republished

چلّا چلّا کر کہوں" میں انسان نہیں ہوں، میں پاگل ہوں، مجھے انسانوں سے نفرت ہے۔ مجھے پاگل خانے کی غلامی بخش دو۔ میں ان سڑکوں کی آزادی نہیں چاہتا۔"

سڑک خاموش ہے اور سنسان۔ بلند ٹہنیوں پر گدھ بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔ یہ دو فرلانگ لمبی سڑک۔

—— کرشن چندر

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ تانگے والے کو گورے نے کیوں مارا؟

2۔ بڑے آدمی کے استقبال کی افسانہ نگار نے کیا جھلک دکھائی ہے؟

3۔ کہانی کے اس منظر کا بیان کیجیے جس نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔

4۔ سڑک کے کسی ایسے منظر کا بیان کیجیے جو عام طور پر سڑکوں پر دیکھنے کو ملتا ہے لیکن اس کہانی میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

© NCERT not to be republished

دیوندر ستیارتھی

(1908—2003)

دیوندر ستیارتھی پنجاب کے ضلع سنگرور میں پیدا ہوئے۔ 1925 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور ڈی اے وی کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ 1927 میں تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جگہ جگہ گھوم کر انھوں نے ہزاروں لوک گیت جمع کیے۔ کچھ عرصے تک دہلی میں انڈین فارمنگ کی ادارت کی۔ 1948 سے 1956 تک آج کل (ہندی) کے مدیر رہے۔ 1976 میں انھیں پدم شری کے اعزاز سے نوازا گیا۔ ان کا انتقال دہلی میں ہوا۔

دیوندر ستیارتھی کی پہلی اردو کہانی 'اور بانسری بجتی رہی' لاہور کے مشہور رسالے 'ادبِ لطیف' میں شائع ہوئی۔ 'نئے دیوتا'، 'اور بانسری بجتی رہی' اور 'چائے کا رنگ' ان کے اردو افسانوں کے مجموعے ہیں۔ ان کے علاوہ 'دھرتی گاتی ہے'، 'میں ہوں خانہ بدوش' اور 'گائے جا ہندوستان' لوک گیتوں کے مجموعے ہیں۔ دیوندر ستیارتھی نے اردو کے علاوہ ہندی اور پنجابی میں بھی علمی اور ادبی سرمایہ چھوڑا ہے۔ ان کے افسانوں کی بنیاد دیومالاؤں اور لوک گیتوں پر ہے۔

© NCERT not to be republished

اَنّ دیوتا

5019CH05

''تب اَنّ دیو، برہما کے پاس رہتا تھا۔ ایک دن برہما نے کہا'' او بھلے دیوتا! دھرتی پر کیوں نہیں چلا جاتا؟'' ان الفاظ کے ساتھ چنتو نے اپنی دل پسند کہانی شروع کی۔ گونڈوں کو ایسی بیسیوں کہانیاں یاد ہیں۔ وہ جنگل کے آدمی ہیں اور ٹھیک جنگل کے درختوں کی طرح اُن کی جڑیں دھرتی میں گہری چلی گئی ہیں۔ مگر وہ غریب ہیں، بھوک کے پیدائشی عادی۔ چنتو کو دیکھ کر مجھے یہ گمان ہوا کہ وہ بھی ایک دیوتا ہے جو دھرتی کے باسیوں کو اَنّ دیو کی کہانی سُنانے کے لیے آنکلا ہے۔ گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ الاؤ کی روشنی میں بغل کی پگڈنڈی کسی جوان کی مانگ معلوم ہوتی تھی۔ گھوم پھر کر میری نگاہ چنتو کے جُھریوں والے چہرے پر جم جاتی۔

کہانی جاری رہی ...... دیوتا دھرتی پر کھڑا تھا، پر وہ بہت اونچا تھا۔ بارہ آدمی ایک دوسرے کے کندھوں پر کھڑے ہوتے، تب جا کر وہ اُس کے سر کو چھو سکتے۔

ایک دن برہما نے سندیس بھیجا۔ یہ تو بہت کٹھن ہے، بھلے دیوتا! تجھے چھوٹا ہونا ہوگا۔ آدمی کا آرام تو دیکھنا ہوگا۔ دیوتا آدھا رہ گیا۔ برہما کی تسلّی نہ ہوئی۔ آدمی کی مشکل اب بھی پوری طرح حل نہ ہوئی تھی۔ اُس نے پھر سندیس بھیجا اور دیوتا ایک چوتھائی رہ گیا۔ اب صرف تین آدمی ایک دوسرے کے کندھوں پر کھڑے ہوکر اس کے سر کو چھو سکتے تھے۔

پھر آدمی خود بولا'' تم اب بھی اونچے ہو، میرے دیوتا!''...... ان دیو اور بھی چھوٹا ہوگیا۔ اب وہ آدمی کے سینے تک آنے لگا۔ پھر جب وہ کمر تک رہ گیا تو آدمی بہت خوش ہوا۔

اُس کے جسم سے بالیں پھوٹ رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ سونے کا پیڑ کھڑا ہے۔ آدمی نے اُسے جھنجھوڑا اور بالیں دھرتی پر آگریں۔

میں نے سوچا، اور سب دیوتاؤں کے مندر ہیں۔ مگر اَنّ دیو، وہ کھیتوں کا قدیمی سرپرست کُھلے کھیتوں میں رہتا ہے، جہاں ہر سال دھان اُگتا ہے۔ نئے دانوں میں دودھ پیدا ہوتا ہے۔

ہلدی بولی'' اب تو دیوتا دھرتی کے بیچوں بیچ کہیں پاتال کی طرف چلا گیا ہے۔''

چنتو نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ ایسا بھیانک کال اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ دھرتی

© NCERT not to be republished

بنجر ہوگئی تھی۔

سال کے سال ہلدی اَنّ دیو کی منّت مانتی تھی۔ ایک ہلدی پر ہی بس نہیں، ہر ایک گونڈ عورت یہ منّت ماننا ضروری سمجھتی ہے۔ مگر اس سال دیوتا نے ایک نہ سُنی۔ کس بات نے دیوتا کو ناراض کردیا؟ غصّہ تو اور دیوتاؤں کو بھی آتا ہے مگر اَنّ دیو کو تو غصہ نہ کرنا چاہیے۔

ہلدی کی گود میں تین ماہ کا بچہ تھا، مَیں نے اُسے اپنی گود میں لے لیا۔ اس کا رنگ اپنے باپ سے کم سانولا تھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے تازہ پہاڑی شہد کا رنگ یاد آرہا تھا۔

ہلدی بولی ''ہائے اَنّ دیو نے میری کوکھ ہری کی اور وہ بھی بھوک میں اور لاچاری میں۔''

بچّہ مسکراتا تو ہلدی کو یہ خیال آتا کہ دیوتا اُس کی آنکھوں میں اپنی مسکراہٹ ڈال رہا ہے۔ پر اس کا مطلب؟ دیوتا مذاق تو نہیں کرتا؟ پھر اُس کے دل میں غصّہ بھڑک اٹھتا۔ دیوتا آدمی کو بھوکوں بھی مارتا ہے اور مذاق اڑا کر اس کا دل بھی جلاتا ہے۔

چنتو بولا ''اس کی کہانی جو مَیں آج کی طرح سَو سَو بار سنا چکا ہوں، اب مجھے نری گپ معلوم ہوتی ہے۔''

ہلدی یہ نہ جانتی تھی کہ چنتو کا طنز بہت حد تک سطحی ہے۔ یہ وہ بھی سمجھنے لگی تھی کہ دیوتا روز روز کے پاپ ناٹک سے ناراض ہوگیا ہے۔

''اَنّ دیو کو نہیں مانتے پر بھگوان کو تو مانو گے۔''

''میرا دل تو تیرے بھگوان کو بھی نہ مانے۔ کہاں ہیں اس کے میگھ راج؟ اور کہاں سو رہا ہے وہ خود؟ ایک بُوند بھی تو نہیں برستی!''

''دیوتا سے ڈرنا چاہیے اور بھگوان سے بھی۔''

چنتو نے سنبھل کر جواب دیا ''ضرور ڈرنا چاہیے...... اور اب تک ہم ڈرتے ہی رہے ہیں!''

''اب آئے نا سیدھے رستے پر۔ جب میں چھوٹی تھی ماں نے کہا تھا، دیوتا کے غصّے سے سدا بچیو!''

''اری کہا تو میری ماں نے بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ پر کب تلک لگا رہے گا یہ ڈر، ہلدی؟''

دیوتا پھر خوش ہوگا اور پھر لہرائے گا وہی پیارا پیارا دھان؟

کال میں پیدا ہوئے بچّے کی طرف دیکھتے ہوئے میں سوچنے لگا ''اتنا بڑا پاپ کیا ہوگا کہ اتنا بڑا دیوتا بھی آدمی کو چھما (معاف) نہیں کرسکتا!''

کال نے ہلدی کی ساری سندرتا چھین لی تھی۔ چنتو بھی اب اپنی بہار کو بُھول رہا تھا...... درخت اب بھی کھڑا تھا مگر ٹہنیاں

© NCERT not to be republished

پرانی ہوگئی تھیں اور نئی کونپلیں نظر نہیں آتی تھیں۔

ہلدی کا بچّہ میری گود میں رونے لگا۔ اُسے لیتے ہوئے اُس نے سہمی ہوئی نگاہ سے اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔ بولی ''یہ کال کب جائے گا؟''

''جب ہم مر جائیں گے اور نہ جانے یہ تب بھی نہ جائے۔''

''یہ کنکی اور کودوں دھان کی طرح پانی نہیں مانگتے۔ یہ بھی نہ اُگے ہوتے تو ہم کبھی کے بھوک سے مر گئے ہوتے ...... انھوں نے ہماری لاج رکھ لی ...... ہماری بھی، ہمارے دیوتا کی بھی۔''

''دیوتا کا بس چلتا تو انھیں بھی اُگنے سے روک دیتا......''

''ایسا بول نہ بولو۔ پاپ ہوگا۔''

''میں کب کہتا ہوں پاپ نہ ہو۔ ہو، سو بار ہو۔''

''نہ نہ، پاپ سے ڈرو۔ اور دیوتا کے غصہ سے بھی۔''

میں نے بیچ بچاؤ کرتے ہوئے کہا ''دوس تو سب آدمی کا ہے۔ دیوتا تو سدا نِردوس ہوتا ہے۔''

رات غم زدہ عورت کی طرح پڑی تھی۔ دُور سے کسی خونی درندے کی دھاڑ گونجی۔ چِتنو بولا ''ان بھوکے شیروں اور ریچھوں کو اَنّ دیو مِل جائے تو وہ اسے کچّا ہی کھا جائیں۔''

بیسا کھو کے گھر روپے آئے تو ہلدی اسے بدھائی دینے آئی ''پتا میں پچیس بھی پانچ سَو ہیں، راموسدا سکھی رہے۔''

''اَنّ دیو سے تو راموہی اچھا نکلا۔'' بیسا کھو نے فرمائشی قہقہہ لگا کر کہا۔

چِتنو بولا۔ ''ارے یار چھوڑ اس اَنّ دیو کی بات......''

ہلدی نے اپنے خاوند کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس طنز سے اُسے چڑ تھی۔ ''دیوتا کتنا بھی بُرا کیوں نہ ہو جائے۔ آدمی کو تو اپنا دل ٹھیک رکھنا چاہیے، اپنا بول سنبھالنا چاہیے۔''

غصے میں جلی بھنی ہلدی اپنی جھونپڑی کی طرف چل دی۔ بیسا کھو نے پھر قہقہہ لگایا۔ ''واہ بھئی واہ۔ اب بھی اَنّ دیو کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔''

چِتنو بولا ''جپنے دو اُسے اَنّ دیو کی مالا۔''

راموبمبئی میں تھا۔ چِتنو سوچنے لگا، کاش اس کا بھی بھائی وہاں ہوتا اور پچیس روپے نہیں تو پانچ ہی بھیج دیتا۔

© NCERT not to be republished

بیسا کھو نے پوسٹ مَین کو ایک دوئّی دے دی تھی۔ مگر اُسے اس بات کا افسوس ہی رہا۔ بار بار وہ اپنی نقدی گنتا اور ہر بار دیکھتا کہ اُس کے پاس چوبیس روپیے چودہ آنے ہیں، پچیس روپیے نہیں۔

جھونپڑی میں واپس آیا تو چنتو نے ہلدی کو بے ہوش پایا۔ اُس نے اُسے جھنجھوڑا۔ ''رسوئی کی بھی فکر ہے۔ اب سونہیں، ہلدی۔ دوپہر تو ڈھل گئی......''

اُس وقت اگر خود اَنّ دیو بھی اُسے جھنجھوڑتا تو ہوش میں آنے کے لیے اُسے کچھ دیر ضرور لگتی۔

تھوڑی دیر بعد ہلدی نے اپنے سرہانے بیٹھے خاوند کی طرف گھور کر دیکھا۔ چنتو بولا'' آگ جلاؤ، ہلدی! ...... دیکھتی نہیں ہو بھوک سے جان نکلی جارہی ہے۔''

''پکاؤں اپنا سر؟''

چنتو نے ڈرتے ڈرتے سات آنے ہلدی کی ہتھیلی پر رکھ دیے اور اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا'' یہ بیسا کھو نے دیے ہیں ہلدی، اور میں سچ کہتا ہوں میں نے اُس سے مانگے نہ تھے۔''

ہلدی شک بھری نگاہوں سے چنتو کی طرف دیکھنے لگی۔ کیا آدمی غریبی میں اتنا گر جاتا ہے؟ مگر چنتو کے چہرے سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس نے مانگنے کی ذلیل حرکت نہیں کی تھی اور پھر جب ایک ایک کرکے سب کے سب پیسے گنے تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں ...... چار روز دال بھات کا خرچ اور چل جائے گا۔

''شکر ہے۔ اَنّ دیو کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔''

''اَنّ دیو کا یا بیسا کھو کا؟''

''اَنّ دیو کا، جس نے بیسا کھو بھائی کے دل میں یہ پریم بھاؤ پیدا کیا۔''

چنتو کا چہرہ دیکھ کر ہلدی کو سوکھے پتے کا دھیان آیا جو ٹہنی سے لگا رہنا چاہتا ہو۔ دور ایک بدلی کی طرف دیکھتی ہوئی بولی ''کاش! بوندا باندی ہی ہوجائے۔'' مگر تیز ہوا بدلی کو اڑا لے گئی اور دھرتی بارش کے لیے برابر ترستی رہی۔

کال نے زندگی کا سب لطف برباد کر دیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا دھرتی رو دے گی۔ مگر آنسوؤں سے تو سوکھے دھانوں کو پانی نہیں ملتا۔ اَنّ دیو کو یہ شرارت کیسے سُوجھی؟ مان لیا کہ وہ خود کسی وجہ سے کسانوں پر ناراض ہوگیا ہے مگر بادلوں کا تو کسانوں نے کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ وہ کیوں نہیں گِھر آتے؟ کیوں نہیں برستے؟ کاش وہ دیوتا کی طرف داری کرنے سے انکار کردیں۔

چار ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔

© NCERT not to be republished

اُس روز یہاں دو تین سو گونڈ جمع ہوئے۔ پھڈ کے صاحب اور منشی جی دھان بانٹ رہے تھے۔ اپنے حصّے کا دھان پا کر ہر کوئی دیوتا کی جے مناتا — اَنّ دیو کی جے ہو۔

چِنتو گاؤں کی پنچایت کا دایاں بازو تھا۔ دھان بانٹنے میں وہ مدد دے رہا تھا۔ لوگ اس کی طرف احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھتے اور وہ محسوس کرتا کہ وہ بھی ایک ضروری آدمی ہے۔ مگر لوگ دیوتا کی جے جے کار کیوں مناتے ہیں؟ کہاں ہے؟...... وہ خود بھی شاید دیوتا ہے......اور شاید اَنّ دیو سے کہیں......''

ہلدی نے سوچا کہ یہ دھان شاید اَنّ دیو نے بھیجا ہے۔ اُسے دُکھیارے گونڈوں کا خیال تو ضرور ہے۔ مگر جب اُس نے پھڈ کے صاحب اور منشی جی کو حلوا اڑاتے دیکھا تو وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ پہلے تو اُس کے جی میں آئی کہ حلوے کا خیال اب آگے نہ بڑھے۔ پر یہ خیال بادل کی طرح اس کے ذہن پر پھیلتا چلا گیا۔

قحط سبھا سے ملا ہوا دھان کتنے دن چلتا؟

چِنتو کے چہرے پر موت کی دُھندلی پرچھائیاں نظر آتی تھیں، مگر وہ دیوتا سے نہ ڈرتا تھا۔ کبھی کبھی گھٹنوں کے بل بیٹھا گھٹنوں غیر شعوری طور پر گالیاں دیا کرتا۔ میں نے سمجھا کہ وہ پاگل ہو چلا ہے۔ دو چار بار میں نے اُسے روکا بھی۔ مگر یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ وہ دیوتا کو اپنے دل سے نکال دینا چاہتا تھا۔ مگر دیوتا کی جڑیں اس کے جذبوں میں گہری چلی گئی تھیں۔

ایک دن چِنتو بہت سویرے اٹھ بیٹھا اور بولا'' دیوتا اب دھنوانوں کا ہو گیا ہے......... پاپی دیوتا! اری میں تو نہ مانوں ایسے دیوتا کو۔''

''پر نہیں، میرا دیوتا تو سب کا ہے۔''

''سب کا ہے۔ اری پگلی، یہ سب گیان جھوٹا ہے۔''

''پر دیوتا تو جھوٹا نہیں۔''

''تو کیا وہ بہت سچا ہے؟ سچا ہے تو برکھا کیوں نہیں ہوتی؟''

''دیوتا کو بُرا کہنے سے دوس ہوتا ہے۔''

''ہزار بار ہو............. وہ اب ہمارے کھیتوں میں کیوں آئے گا؟ وہ دھنوانوں کی ھوری کچوری کھانے لگا ہے۔ نردھن گونڈوں کی اب اُسے کیا پرواہے؟''

چِنتو کی نکتہ چینی ہلدی کے من میں غم گھول رہی تھی۔ اُس نے جھونپڑی کی دیوار سے ٹیک لگا لی اور دھیرے دھیرے اچھے

© NCERT not to be republished

وقتوں کو یاد کرنے لگی، جب بھوک کا بھیانک منہ کبھی اتنا نہ کھُلا تھا۔وہ خوشی پھر لوٹے گی، دیوتا پھر کھیتوں میں آئے گا۔اس کی مسکراہٹ پھر نئے دانوں میں دودھ بھردے گی۔اس کے من میں عجب کشمکش جاری تھی۔دیوتا !............پاپی..........نہیں تو.........؟نہیں تو وہ باہر چلا گیا تو کیا ہوا۔کبھی تو اُسے دیا آئے گی ہی۔

ہلدی سنبھل کر بولی ''سچ مانو، میرے پتی، دیوتا پھر آئے گا یہاں........''

چنّو کا بول اور بھی تیکھا ہوگیا۔''اری اب بس بھی کر۔ تیرا دیوتا کوئی سانپ تھوڑی ہے جو تیری بین سُن کر بھاگا چلا آئے گا؟''

اُس دن راموبمبئی سے لوٹ آیا۔اسے دیکھ کر ہلدی کی آنکھوں کو ایک نئی زبان مِل گئی۔بولی ''سناؤ، رامو بھائی بمبئی میں دیوتا کو تو تم نے دیکھا ہوگا۔''

راموخاموش رہا۔

میرا خیال تھا کہ رامو نے بمبئی میں مزدورسبھا کی تقریریں سن رکھی ہوں گی اور وہ صاف صاف کہہ دے گا کہ اَنّ آدمی آپ اُپجاتا ہے اپنے لہو سے، اپنے پسینے سے۔اگر آدمی، آدمی کا لہو چوسنا چھوڑ دے تو آج ہی سنسار کی کایا پلٹ جائے۔کال تو پہلے سے

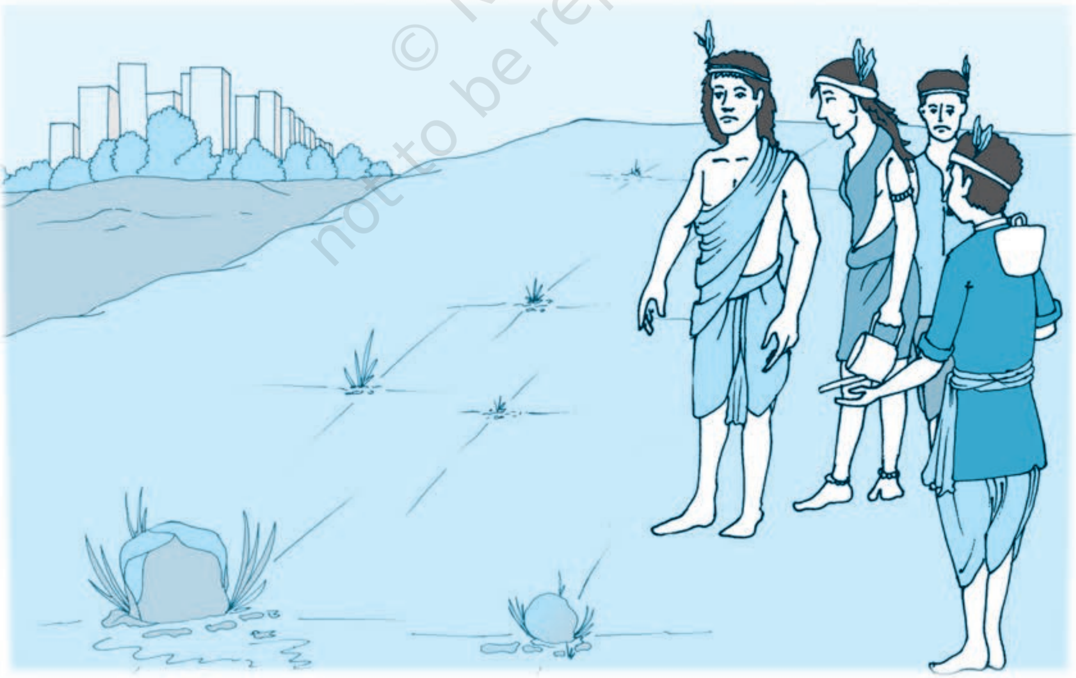

© NCERT not to be republished

پڑتے آئے ہیں۔ بڑے بڑے بھیانک کال۔مگراب سرمایہ دار روز روز کسانوں اور مزدوروں کا لہو چوستے ہیں اور غریبوں کے لیے اب سدا ہی کال پڑا رہتا ہے۔اور یہ کال چھومنتر سے نہیں جانے کا۔اس کے لیے تو سارے سماج کو جھنجھوڑنے کی ضرورت ہے۔

ہلدی پھر بولی ''رامو بھائی! چپ کیوں سادھ لی تم نے؟......ہمیں کچھ بتادو گے تو تمہاری وِدّیا تو نہ گھٹ جائے گی۔بمبئ میں تو بہت برکھا ہوتی ہوگی۔پانی سے بھری کالی اُودی بدلیاں گِھر آتی ہوں گی........اور بجلی چمکتی ہوگی ان بدلیوں میں رامو!..........اور وہاں بمبئ میں دیوتا کو رتی بھر کشٹ نہ ہوگا............''

رامو کے چہرے پر مسکراہٹ پیدا ہونے کے فوراً بعد کسی قدر سنجیدگی میں بدل گئی۔وہ بولا ''ہاں ہلدی! اَنّ دیو اب بمبئ کے محلوں میں رہتا ہے......روپوں میں کھیلتا ہے......بمبئ میں۔'' ہلدی کچھ نہ بولی۔شاید وہ اُن کے متعلق سوچنے لگی جب ریل ادھر آنکلی تھی اور اَنّ دیو پہلی گاڑی سے بمبئ چلا گیا تھا۔

آنسو کی ایک بوند جو ہلدی کی آنکھ میں اٹکی ہوئی تھی، اس کے گال پر ٹپک پڑی۔بڑے آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے۔میں نے کہا'' آج ضرور دھرتی پر پانی برسے گا۔''

ہلدی خاموشی سے اپنے بچّے کو تھپکنے لگی۔شاید وہ سوچ رہی تھی کہ کیا ہوا اگر دیوتا کو وہاں سُندریاں مِل جاتیں ہیں۔کبھی تو اُسے گھر کی یاد ستائے گی ہی اور پھر وہ آپ ہی آپ اِدھر چلا آئے گا۔

___ دیوندر ستیارتھی

© NCERT not to be republished

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ برہما نے اَنّ دیوتا کو کیا سندیس (پیغام) بھیجا؟

2۔ چِنتو اَن دیوتا سے ناراض کیوں رہتا تھا؟

3۔ مصنف نے کہانی کے آخری حصّے میں کال کا ذمہ دار کسے ٹھہرایا ہے اور کیوں؟

احمد ندیم قاسمی

(1916 – 2006)

احمد ندیم قاسمی ضلع شاہ پور (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آبائی گاؤں ہی میں ہوئی۔ 1935 میں بی۔اے کی ڈگری حاصل کی اور پنجاب کے مختلف اضلاع میں ملازمت کرتے رہے۔ 1942 میں ''تہذیبِ نسواں'' اور ''پھول'' کے ایڈیٹر رہے۔ وہ ''ادبِ لطیف'' اور ''نقوش'' کے بھی مدیر رہے۔ انھوں نے ''فنون'' کے نام سے خود اپنا بھی ایک سہ ماہی جریدہ جاری کیا جس کے وہ آخر وقت تک مدیر رہے۔

احمد ندیم قاسمی ادب میں کئی حیثیتوں کے مالک تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور ایک معروف ادبی صحافی بھی۔ ان کے نصف درجن کے قریب شعری مجموعے اور ایک درجن سے زیادہ افسانوں کے مجموعے شائع ہوئے۔ ادبی مضامین اور اخباری کالم نویسی کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا، انھوں نے سب سے زیادہ شہرت اپنے افسانوں کی وجہ سے پائی۔ پنجاب کی دیہی زندگی اور عام انسانوں کے مسائل کی عکاسی کا وہ غیر معمولی سلیقہ رکھتے تھے۔ اسی لیے عام پڑھنے والوں میں ان کی کہانیاں بہت مقبول تھیں۔

احمد ندیم قاسمی کا تعلق ایک روایتی مذہبی خاندان سے تھا۔ ترقی پسند تحریک سے بھی انھوں نے اپنی ترجیحات کے ساتھ رابطہ قائم رکھا۔ ان کے اس ذہنی رویہ کے اثرات ان کی تخلیقات میں صاف دکھائی دیتے ہیں۔

© NCERT not to be republished

سُلطان

5019CH06

دادا کے بائیں پنجے میں سلطان کی کھوپڑی تھی اور دائیں میں لاٹھی جو پٹری کے پکّے فرش پر ٹھن ٹھن بجے جارہی تھی۔سلطان ذرا سا رُکا تو دادا جلدی سے بولنے لگا ”ہے بابو جی۔اندھے فقیر کو——“

”نہیں نہیں دادا“ سلطان بولا ”بابو نہیں ہے۔مداری کا تماشا ہو رہا ہے۔“

”تیرے مداری——“ گالی کو مکمل کرنے سے پہلے ہی دادا پر کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ سلطان کے سر پر رکھے ہوئے ہاتھ کو اپنے سینے پر رکھ کر کھانسی کے ایک لمبے چکر میں ڈوب گیا۔

جب تک دادا کی سانس معمول پر آئی، سلطان مداری کی ٹوکری کے نیچے رکھے ہوئے چیتھڑوں کو سفید براق رنگ کے دو موٹے موٹے کبوتروں میں بدلتا دیکھ چکا تھا۔

دادا نے اپنا بایاں بازو ہوا میں پھیلا کر پوچھا ”کہاں گیا تو؟“

سلطان نے فوراً اپنا سر دادا کے پنجے میں تھما دیا اور وہ پٹری پر چلنے لگے۔

ایک جگہ دادا کی لاٹھی بجلی کے کھمبے سے ٹکرائی تو کھمبا بج اُٹھا اور سلطان بولا ”دادا! سنا؟ کھمبا کیسا بولا؟“

”ہاں“ دادا رُک گیا اور کھمبے کو ایک بار بجانے کی کوشش کی مگر نشانہ چوک گیا۔”کھمبے بولتے ہیں۔لے ذرا سا بجا لے۔“

سلطان نے دادا کی لاٹھی کھمبے پر ماری اور دادا بولا ”دیکھا؟ جب میں تمھاری طرح چھوٹا سا تھا تو دیر دیر تک کھمبوں پر کان رکھے کھڑا رہتا تھا۔ان دنوں کھمبوں میں میمیں انگریزی بولتی تھیں۔“ پھر دادا نے میموں کی نقل کی۔”یُو گُڈ۔یُو بیڈ۔“

”میمیں بولتی تھیں کھمبوں میں؟“ سلطان حیران رہ گیا۔”آج کل کون بولتا ہے دادا؟“ پھر ایک دم سلطان کا لہجہ بدلا اور اس نے سرگوشی میں دادا سے کہا ”دو بابو آرہے ہیں دادا۔“

دادا جلدی جلدی بولنے لگا ”بابو جی۔اندھے فقیر کو راہِ مولا ایک روٹی کے پیسے دیتے جاؤ۔اللہ تمھیں ترقیاں دے۔اللہ تمھیں بیٹے اور پوتے دے۔“

ایک بابو قہقہ مار کر بولا ”یہ بڈھا تو خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف پروپیگنڈا کرتا پھرتا ہے۔“ پھر دونوں زور زور سے ہنستے

© NCERT not to be republished

ہوئے گذر گئے ۔

''چلے گئے!'' سلطان نے آہستہ سے کہا پھر ذرا سارُک کر اس نے بابوؤں کو گالی دے دی۔

دادا نے اپنے پنجے کو سلطان کی کھوپڑی پر دبایا۔ ''پھر وہی بک بک۔ کل کیا کہا تھا میں نے؟ کبھی کسی نے سُن لیا تو اِدھر کا منھ اُدھر لگا دے گا۔''

سلطان چپ چاپ دادا کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد بولا ''میرے سر پر جہاں تمھارا انگوٹھا ہے نا دادا۔ وہاں ذرا سا کھجا دو۔''

دادا نے اپنا انگوٹھا سلطان کی کنپٹی پر زور سے رگڑا۔

''سلطان۔'' خاصی دیر کے بعد دادا بولا۔ ''کیا بات ہے آج تو تم کہیں رُکتے ہی نہیں، آج بابولوگ کہاں چلے گئے؟''

''مر گئے'' سلطان نے جواب دیا۔ پھر یکا یک رُک گیا اور بولا ''آج کون سا دن ہے دادا؟''

''میں کیا جانوں بیٹا۔'' دادا بولا۔ ''تم دِن یاد رکھا کرو نا۔ میرے لیے تو دن رات دونوں برابر ہیں۔'' دادا نے ذرا سا رُک کر سوچا پھر بولا۔

''پرسوں تم مجھے نیلا گنبد کی مسجد میں لے گئے تھے نا؟ پرسوں جمعہ تھا۔ اس حساب سے تو آج اتوار ہے۔ بیڑا غرق ہو اس اتوار کا۔ آج تو بابولوگ اپنے گھروں میں بیٹھے بیوی بچوں سے کھیل رہے ہوں گے۔''

سلطان یوں دم بخود کھڑا رہ گیا جیسے کوئی زبردست حادثہ ہو گیا ہے۔ اچانک ٹن کی آواز آئی۔ کسی راہ چلتے نے سلطان کے ہاتھ کے کٹورے میں ایک پیسہ ڈال دیا تھا۔

''کچھ ملا؟ کیا ملا؟'' دادا نے پوچھا۔

''ایک پیسہ ہے۔'' سلطان بولا۔ ''چھوٹے والا۔ نئے والا۔''

دادا نے اپنا پنجہ سلطان کے سر پر گھمایا۔ ''جا کوئی چیز لے کر کھالے۔ جا۔ میں یہیں کھڑا ہوں۔''

''ایک پیسے کا تو کوئی کچھ نہیں دیتا دادا'' سلطان بولا۔ ''دو تین ہو گئے۔ گنڈیری کھاؤں گا۔''

دادا نے سلطان کے سر پر سے ہاتھ اٹھا کر جیب میں ڈالا۔ ''لے یہ دو نئے پیسے کل کے بچے رکھے ہیں۔ کوئی چیز کھالے۔ تو نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں۔ بچوں کو تو بڑی بھوک لگتی ہے۔ جا۔''

سلطان نے پیسے لے لیے تو دادا بولا۔ ''جلدی سے آجا۔ اچھا میں یہیں کھڑا ہوں۔ کہاں کھڑا ہوں میں؟''

© NCERT not to be republished

''ذرا سا بائیں کو ہو جا دادا'' سلطان نے دادا کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''کھمبے کے ساتھ لگ جا۔''

دادا کھمبے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دیر تک یوں ہی کھڑا رہا۔ پھر وہ کھمبے پر کان رکھ کر جیسے کچھ سننے لگا اور مسکرانے لگا۔ یکا یک وہ چونک سا اٹھا اور سلطان کو پکارنے لگا۔ ''سلطان۔ اے سلطان۔'' پھر وہ اُسے گالیاں دینے لگا۔ ''او سلطان! تو کہاں جا کر مر گیا؟'' کوئی جواب نہ پا کر وہ اِدھر اُدھر گھوم کر بولا۔ ''اے بھئی، خدا کے بندہ! میرا چھوٹا سا پوتا ادھر کہیں سے پیسے دو پیسے کی کوئی چیز لینے گیا ہے۔ سلطان نام ہے۔ کہیں تانگے موٹر کے نیچے تو نہیں آ گیا بدنصیب کی اولاد۔'' پھر وہ چلّا دیا۔ ''او سلطان۔''

''آیا دادا۔'' دور سے سلطان کی آواز آئی۔ مگر زور سے چیخنے کی وجہ سے دادا کے کھانسی چھوٹ گئی۔

دادا کی سانس معمول پر آنے لگی تو اس نے پلٹ کر جیسے کھمبے سے پوچھا۔ ''کہاں مر گیا تھا تو؟''

سلطان نے دادا کا بایاں ہاتھ اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ ''مداری تماشا دکھا رہا تھا۔ پیٹ سے گولے نکال رہا تھا۔''

دادا نے اپنے پنجے کو سلطان کی کھوپڑی پر یوں دبایا جیسے اسے اوپر اٹھا لے گا۔ ''چل گھر چل۔ وہاں میں تجھے مداری کا تماشا دکھاؤں۔ یہ نہیں سوچا کہ میں اندھا اپاہج یہاں رستے میں کھڑا ہوں۔''

سلطان چُپ چاپ چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد دادا نے نرمی سے پوچھا ''کیا کھایا؟''

''گنڈیریاں'' سلطان بولا۔

''ارے بدبخت گنڈیریاں تو پانی ہوتی ہیں۔'' دادا پھر غصّے ہونے لگا۔ ''چنے کھا لیتا تو دوپہر تک کا سہارا تو ہو جاتا۔''

سلطان چپ چاپ چلتا رہا۔

''کٹورا ہاتھ میں لٹکا تو نہیں رکھا؟'' دادا نے پوچھا۔

''نہیں دادا'' سلطان بولا۔

''ہاں'' دادا نے نرمی سے نصیحت کی۔ ''اُٹھائے رکھا کرو۔ لٹکا رہے تو لوگ سمجھتے ہیں یہ بھکاری نہیں ہیں۔ سودا لینے چلے ہیں۔''

سلطان جھکنے لگا۔ ''ایک بار میں کٹورے میں تیل لینے جا رہا تھا تو ایک بابو نے اس میں دوّنی ڈال دی تھی۔ یاد ہے دادا؟''

''ہاں'' دادا بولا۔ ''پر ایسا کم ہوتا ہے ایسے بابو کم ہوتے ہیں۔''

''دادا'' سلطان نے کہا۔ ''انگوٹھے والی جگہ کو ایک بار پھر کھجا دے۔''

دادا نے سلطان کی کنپٹی پر انگوٹھا زور سے رگڑا اور بولا۔ ''آج واپس جا کر میں زیبو بیٹی سے کہوں گا کہ میرے بچّے کے سر

© NCERT not to be republished

سے جوئیں چُن لے۔

تم بھی اس کا کوئی کام کر دینا۔ بالٹی بھر لا نا نل سے۔ اچھا؟''

گھر واپس آ کر جب سلطان ، دادا کو کھٹولے کے پاس لاتا تو کہتا۔ ''لے دادا بیٹھ جا۔'' دادا لاٹھی کو کھٹولے کے پائے سے لگا دیتا اور سلطان کے سر پر سے ہاتھ اٹھا کر کھٹولے پر بیٹھ جاتا۔ سر پر سے دادا کا ہاتھ اُٹھتے ہی سلطان کو یوں محسوس ہوتا جیسے ایک دم وہ ہلکا پھلکا ہو گیا ہے اور اس کے پاؤں میں لوہے کے گولوں کی جگہ ربڑ کے پہیے بندھ گئے ہیں۔ وہ چپکے سے چھپریا میں سے نکل آتا۔ پھر خالہ زیبو کی آنکھ بچا کر بھاگ نکلتا اور بنگلوں سے گھرے ہوئے میدان میں پہنچ جاتا جہاں امیروں کے بچے کرکٹ کھیلتے تھے اور غریبوں کے بچے انھیں گیند اٹھا کر دیتے تھے۔ پھر جب وہ میدان خالی کر دیتے تھے تو بیروں، خانساموں اور چپراسیوں کے بچّے بلّور کی گولیاں کھیلتے تھے۔ ایک بار سلطان نے بھی اس کھیل میں شامل ہونے کی کوشش کی تھی۔ چند روز تک کھیلا بھی تھا۔ مگر پھر ایک دن ایک لڑکے نے انکشاف کیا تھا کہ سلطان تو اندھے بھکاری کا بچہ ہے۔ جب سے اسے کھیل میں شامل نہیں کیا جاتا تھا۔ البتہ جب کوئی بچہ بلور کی گولی بہت دور پھینک بیٹھتا تو سلطان لپک کر یہ گولی اُٹھا لاتا تھا اور مالک کے حوالے کرنے سے پہلے اسے چند بار اُنگلیوں میں گھما لیتا تھا۔ ایک بار دادا کے سامنے دیر تک زار زار رو کر اس نے چند پیسے حاصل کر لیے تھے اور اُن سے بلور کی گولیاں خرید لایا تھا۔ مگر جب میدان میں پہنچا اور بچوں نے اس کے ہاتھ میں گولیاں دیکھی تھیں، تو وہ یہ کہہ کر اس پر جھپٹ پڑے تھے کہ یہ تو ہماری گولیاں ہیں۔ وہ اس دن خوب پاؤں پٹخ پٹخ کر رویا تھا۔ مگر دوسرے دن پھر میدان میں جا نکلا تھا۔

ایک بار میدان میں آنے کے بعد اُسے واپس گھر جانے سے ڈر لگتا تھا کہ کہیں دادا پھر سے اس کے سر کو اپنے سوکھے ہاتھ میں جکڑ کر اسے سڑک سڑک نہ لیے پھرے۔ اسے معلوم تھا کہ صبح کو آنکھ کھلتے ہی اسے دادا کے ساتھ گدا کرنے کے لیے نکل جانا ہوگا۔ اس لیے کھٹولے سے اُٹھتے ہی اُسے ایسا لگتا جیسے اس نے پتھر کی ٹوپی پہن لی ہے۔ دادا کے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں درد کی پانچ لہریں بن کر اس کی کھوپڑی میں دوڑ جاتیں اور جب دادا نماز پڑھنے اور دعا مانگنے کے بعد لاٹھی سنبھالتا اور سلطان کو پاس بلا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتا تو سلطان آدھا مر جاتا۔ دادا کا یہ ہاتھ سوتے جاگتے میں اُسے بھوت کی طرح ڈراتا تھا۔ یہ ہاتھ اسے گرفتار کر لیتا تھا۔ اور وہ پٹری پر یوں چلتا تھا جیسے ملزم ہتھکڑیاں پہنے سپاہی کے ساتھ چلتے ہیں اور پھر قید خانے کے صدر دروازے کے جنگلے میں سے باہر سڑک پر لوگوں کو چلتا پھرتا ہنستا مسکراتا دیکھتے ہیں مگر بس دیکھتے رہ جاتے ہیں اور ان کی بصارت کے ساتھ سلاخیں صلیبوں کی طرح چمٹ جاتی ہیں۔

جب دادا کا ہاتھ اپنے سر پر رکھے وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا تھا تو کئی بار اس کا جی چاہا کہ گنڈیری والے کے خوانچے میں

© NCERT not to be republished

سے جو گنڈیری لڑھک کر گندی نالی کے کنارے جا کر رُک گئی تھی، وہ لپک کر کھالے۔ بابو نے کیلا کھا کر جو چھلکا پھینکا ہے اُسے بڑھ کر اٹھالے اور ذرا سا چاٹ لے۔ مگر جب بھی اس نے کسی بہانے دادا سے ذرا سا رک جانے کو کہا تو دادا نے اپنی انگلیاں اس کے سر کی ہڈی میں گاڑ دیں اور بولا'' میں تجھے ٹہلانے نکلا ہوں کہ تو مجھے گدا کرانے نکلا ہے؟ ارے بدبخت! دن بھر میں چار پانچ آنے کی بھیک نہ ملی تو زیبو بٹی دو وقت کی روٹی ہمیں کیا اپنی گرہ سے کھلائے گی؟ اس کی یہی مہربانی کیا کم ہے کہ اس نے ہمارے سر چھپانے کو اپنی چھپریا دے رکھی ہے؟''

کافی دنوں کی بات ہے دادا بنگلوں سے بھیک مانگنے کے بعد جب کوارٹروں کے پیچھے بیگو کو چوان کے گھروندے کے سامنے سے گذرا تو اس کی ماں زیبو لپک کر آئی اور بولی'' ارے بابا۔ دعا کر۔ اللہ میرے بیٹے کی پسلی کا درد ٹھیک کر دے۔ میں تجھے پورا ایک روپیہ دوں گی۔''

دادا نے وہیں کھڑے ہو کر دُعا مانگی تھی پھر چند روز کے بعد اس نے سلطان کو دوبارہ ان ہی بنگلوں کی طرف چلنے کو کہا۔ ابھی وہ بنگلوں تک نہیں پہنچے تھے کہ زیبو نے انھیں رستے ہی میں پکڑ لیا۔ دادا کو ایک روپیہ دیا اور بولی'' مجھے بتا تو کہاں رہتا ہے بابا؟ میں جمعرات کی جمعرات تیری سلامی کو آیا کروں گی۔'' پھر جب اُسے معلوم ہوا تھا کہ یہ دادا پوتا تو کسی دکان کے چھجے تلے پڑ رہتے ہیں تو اس نے بیٹے سے کہہ کر چھپریا خالی کرا دی تھی اور جب سے دونوں وہیں رہتے تھے۔ دن بھر کی بھیک اس کو لا دیتے تھے اور وہ اسی حساب سے انھیں روٹی پکا دیتی تھی۔ ان دنوں دادا سے وہ اپنے بیٹے کے اولاد ہونے کی دعا کرا رہی تھی۔

سلطان کو دادا کے علاوہ خالہ زیبو بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ جب بھی دادا کو واپس چھپریا میں پہنچا کر نکلا تو زیبو سے چھپ کر نکلا۔ ورنہ وہ شور مچا دیتی تھی کہ لو دیکھو۔ اپنے بوڑھے اپاہج دادا کو اکیلا چھوڑ کر کھیلنے چلا ہے۔

جس روز دادا دن ڈھلے ہی تھک کر واپس آ جاتا اور سلطان کو کھسک جانے کا موقع نہ ملتا تو ذرا سا ستا لینے کے بعد وہ پھر سے لاٹھی سنبھال کر کہتا'' چل سلطان۔ چوک کا ایک اور چکر لگوا دے۔ آج کچھ زیادہ مل گیا تو کل تیری چھٹی''۔ مگر یہ چھٹی کبھی نہیں ملتی تھی۔ اس لیے کہ کچھ زیادہ کبھی نہیں ملتا تھا۔

البتہ اب کچھ عرصے سے یوں ہونے لگا تھا کہ دادا کو آدھی رات کے بعد دمے کے دورے پڑتے اور وہ کھانس کھانس اور ہانپ ہانپ کر صبح تک ادھ موا ہو جاتا۔ اس روز وہ گدا پر نہیں نکلتا تھا۔ مگر سلطان کو جب بھی چھٹی نہیں ملتی تھی۔ وہ دن بھر بیٹھا دادا کے کندھے اور پسلیاں دباتا رہتا اور اس کے ہاتھ رکتے تو دادا کھانسی سے بھنچی ہوئی آواز میں پکارتا'' کیوں سلطان کیا کر رہا ہے؟ مر تو نہیں گیا؟''

© NCERT not to be republished

سلطان فوراً دادا کے کندھے پکڑ لیتا اور جی میں کہتا ''اللہ کرے تو خود مرجائے دادا۔تو مرجائے تو اللہ قسم کیسے مزے آئیں۔اللہ کرے تو جلدی جلدی سے بس ابھی ابھی مرجائے اور میں بنگلے کی بی بی سے اس کے بچے کی ٹوپی کی بھیک مانگ کر اپنا سر ڈھانپ لوں۔''

پھر ایک روز دادا سچ مچ مرگیا۔ وہ ٹوٹتی رات سر کو گھٹنوں پر رکھے کھانستا اور ہانپتا رہا اور اس کی پسلیاں پھنکتی اور سمٹتی رہیں۔سلطان اس کے کندھے دباتا رہا اور اس کی ریڑھ کی ہڈی کے کناروں کو انگوٹھوں کی پوروں سے سہلاتا رہا۔پھر وہ سوگیا۔ اور جب صبح کو اس کی آنکھ کھلی تو روتی ہوئی خالہ زیبو نے اسے بتایا کہ ''سلطان۔ تیرا دادا تو اللہ کو پیارا ہوگیا۔''

ایکا ایکی سلطان کے اندر چار طرف پھلجھڑیاں سی چھوٹیں اور وہ بولا ''سچ؟'' جیسے اسے یقین نہیں آرہا کہ دادا لوگ بھی مرسکتے ہیں۔پھر بیکو کو جوان آس پاس کے لوگوں کو جمع کرلایا اور وہ دادا کو غسل دے کر دفنانے لے گئے۔

خالہ زیبو وقفے وقفے سے روتی رہی اور اس کی بہو نے بھی سلطان کو بڑے پیار سے دن بھر اپنے پاس بٹھائے رکھا۔ بیکو بھی قبرستان سے واپس آیا تو سلطان کے لیے گنڈیریاں لیتا آیا اور گنڈیریاں چوستے ہوئے سلطان نے سوچا۔ جب دادا مرجاتے ہیں تو کیسے مزے آتے ہیں۔

رات بھی خالہ زیبو نے اسے چھپریا میں نہ جانے دیا کہ بچّہ ہے، ڈرجائے گا۔صبح کو اس نے سلطان کو رات کی ایک چپاتی اور لسّی کا ایک پیالہ دیا۔خوب پیٹ بھر کر وہ اٹھا تو زیبو نے پوچھا۔ ''کہاں چلے بیٹا؟''

سلطان کو یہ سوال بڑا عجیب سا لگا۔ہم کہیں بھی جائیں، تمھیں کیا۔ہمارا دادا تو مرگیا ہے۔

سلطان کو خاموش پاکر وہ بولی ''نہیں بیٹا۔ کھیلتے ویلتے نہیں ہیں۔'' پھر وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر چھپریا میں لے آئی اور کٹورا اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولی ''آج کہیں سے آٹھ دس آنے کمالا.....میں تجھے چاول کھلاؤں گی۔ جا بیٹا۔ کسی آباد سڑک کا ایک پھیرا لگالے۔اللہ تیرا ساتھی ہو۔''

سلطان نے ہاتھ میں کٹورا لے لیا مگر چھپریا سے باہر آتے ہی وہ رک گیا۔واپس چھپریا میں گھسا جیسے کچھ بھول آیا ہے۔پھر وہ بلبلا کر رو دیا اور خالہ زیبو کے پھیلے ہوئے ہاتھوں سے کترا کر بھاگ نکلا۔

اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہورہا تھا جب اس نے سڑک پر ایک بابو کے سامنے کٹورا پھیلایا۔ ''بابو جی اندھے فقیر کو راہِ مولا ایک روٹی۔'' اس نے زار زار روتے ہوئے دادا کے الفاظ دہرا دیے۔

''کیا تو اندھا ہے؟'' بابو نے سختی سے پوچھا۔

© NCERT not to be republished

سلطان کو یکایک اپنی غلطی کا احساس ہوا اور گھبرا کر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ''جھوٹ بھی بکتا ہے اور روتا بھی ہے؟''

بابو نے ڈانٹا۔ ''نوکری کرے گا؟'' اس نے پوچھا پھر سلطان کو مسلسل روتا پا کر جانے لگا۔

سلطان رُندھی ہوئی آواز میں بولا ''ہے بابو جی۔ راہِ مولا پیسے دو پیسے دیتے جاؤ۔''

بابو پلٹے بغیر آگے بڑھ گیا۔ وہ کافی دور نکل گیا تھا جب روتا ہوا سلطان یکایک اس کی طرف دوڑنے لگا اور پکارنے لگا ''بابو جی۔ ہے بابو جی۔''

بابو رک گیا۔ آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگ بھی ٹھٹھک گئے۔ ''نوکری کرے گا؟'' بابو نے پوچھا۔

''بابو جی۔'' ہانپتا ہوا سلطان بابو کے پاس رکا۔ پھر اس کا نچلا ہونٹ ذرا سا لٹکا اور وہ بولا۔ ''بابو جی —— دیکھیے —— میں نوکری نہیں مانگتا۔ بھیک نہیں مانگتا۔'' اس نے کٹورا زمین پر پٹخ دیا۔

''تو پھر مجھے کیوں پکارا؟'' بابو نے جمع ہوتے ہوئے لوگوں پر ایک نظر دوڑا کر ذرا تلخی سے پوچھا۔

ایک دم سلطان کی آنکھوں میں اکٹھے بہت سے آنسو آ گئے۔ اس کے ہونٹ پھڑکنے لگے اور وہ بڑی مشکل سے بولا ''بابو جی۔ خدا آپ کا بھلا کرے۔ خدا آپ کو بہت بہت دے۔ کیا آپ ذرا دور تک میرے سر پر ہاتھ رکھ کر چل سکیں گے؟''

''لو اور سنو۔'' بابو احمقوں کی طرح ہجوم کو دیکھنے لگا۔

—— احمد ندیم قاسمی

سوالوں کے جواب لکھیے :

1۔ سلطان کو زیبو خالہ کا باہر جانے پر ٹوکنا کیوں بُرا لگتا ہے؟

2۔ سلطان کو دادا کا ہاتھ لوہے کی ٹوپی جیسا کیوں لگتا تھا اور بعد میں اس کے نہ ہونے پر اسے کیا محسوس ہوا؟

3۔ سلطان نے بابو جی سے اپنے سر کے اوپر ہاتھ رکھ کر تھوڑی دور چلنے کی درخواست کیوں کی؟

© NCERT not to be republished

کلام حیدری

(1930—1994)

محمد کلام الحق حیدری ان کا پورا نام تھا۔کلام حیدری کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ان کی پیدائش مونگیر (بہار) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم ایٹہ (اتر پردیش) میں حاصل کی۔ رین کالج، کلکتہ سے آئی۔کام کا امتحان پاس کیا۔ رانچی کالج، رانچی سے بی۔اے اور پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔اے (اردو) کی ڈگریاں حاصل کیں۔ پورنیہ ڈگری کالج میں ملازمت کی۔ انجمن ترقی اردو بہار کے جنرل سکریٹری اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرگرم رکن رہے۔کلام حیدری نے ہفتہ وار 'مورچہ' اور ماہنامہ 'آہنگ' شہر گیا سے شائع کیا اور ان کی ادارت بھی کی۔

کلام حیدری کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ 'بے نام گلیاں' کے عنوان سے 1955 میں شائع ہوا۔ ان کے دوسرے افسانوی مجموعوں کے نام 'صفر'، 'الف لام میم' اور 'گولڈن جبلی' ہیں۔ 'برملا' ان کے ادبی تبصروں کا مجموعہ ہے۔ 'ادب اور تصوف' اور 'تفہیمات' ان کی علمی کتابیں ہیں۔

© NCERT not to be republished

5019CH07

سخی

میں زکریا اسٹریٹ کے ایک گندے اور چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھا ہوں۔ سامنے سیاہ رنگ کے ٹیبل پر چھوٹی سی چائے کی پیالی رکھی ہے جس میں تلخ قسم کی چائے پر بالائی پڑی ہوئی ہے۔ میرے ٹیبل کے سامنے ایک لمبا سا ٹیبل ہے جس پر کئی دوسرے لوگ بیٹھے ہیں، ان میں سے ایک شخص کو میں پہچانتا ہوں۔ وہ جو شطرنجی ڈیزائن کی لنگی پہنے ہوا ہے اور جس کی گنجی بجائے بٹن کے فیتے سے بند ہونے والی ہے، میں اسے صرف اس وجہ سے پہچانتا ہوں کہ وہ مجھ سے مہینے میں ایک بار منی آرڈر لکھواتا ہے۔ کبھی پچاس، کبھی چالیس اور کبھی سو بھی۔

یہ کہاں رہتا ہے، میں نہیں جانتا۔ یہ کیا کرتا ہے، یہ بھی میں نہیں جانتا۔ یہ منی آرڈر کہاں بھجواتا ہے صرف یہ میں جانتا ہوں۔ بی بی سکینہ معرفت شرافت حسین، بیڑی دکان، پورنیہ۔

میں نے اب چائے کی پیالی اپنے ہونٹوں سے لگا لی ہے اور بالائی ہونٹوں سے الجھ رہی ہے۔ میں نے پھونک مار کر بالائی کو کچھ ہٹا دیا ہے۔ اور تب پہلے گھونٹ کے ساتھ ایک میٹھی تلخ دھار حلق سے پیٹ میں اترتی ہوئی محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے پیالی واپس طشتری میں رکھ دی ہے۔

بی بی سکینہ کے بارے میں مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ یہ اس شطرنجی ڈیزائن کی لنگی والے کی بیوی ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کا نام مولا ہے اور منی آرڈر لکھواتے وقت اپنا نام مولا بخش لکھواتا ہے۔ پہلے پہل جب میں نے اس سے منی آرڈر فارم پر لکھنے کے لیے اس کا پتہ پوچھا تو اس نے اپنا نام مولا بخش بتایا اور کہا، ”معرفتی آپ اپنا ہی لکھ دیجیے۔“

چنانچہ میری معرفت روپیہ بھیجنے والے کے پتے سے بھی مجھے ناواقف ہی رہنا پڑا۔

میں نے چائے کی پیالی دوبارہ اٹھا لی ہے اور بالائی کو غور سے دیکھ رہا ہوں جو چائے پینے میں حارج ہوگی۔ میں ایک لمبا گھونٹ لیتا ہوں اور بالائی تھوڑی سی چائے سمیت میرے منھ میں چلی جاتی ہے اور میں منھ چلانے لگتا ہوں۔

بی بی سکینہ کا شوہر پست قد کا گٹھا ہوا، سیاہی مائل آدمی ہے، جس کے کان کی لو تھوڑی سی کٹی ہوئی ہے اور گالوں کی دونوں جانب کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ چہرہ بڑا اور محنتی آدمی کا سا معلوم ہوتا ہے۔ سینہ چکلا اور گردن بھری بھری مگر اوسط درجے کی لمبی

© NCERT not to be republished

ہے۔آنکھوں میں چمک ہے مگر جیسے وہ دھندلا ہٹوں میں ہو۔داہنے ہاتھ کی شہادت والی انگلی کا ناخن نکیلا اور لمبا ہے۔

میں نے پیالی پھر ہاتھ میں لے لی ہے۔اور ہوٹل میں آنے والے دو افراد کو دیکھنے لگا ہوں جو دروازے کے پاس ہی رک گئے ہیں اور ہوٹل کا جائزہ لے رہے ہیں۔ایک کے سر پر 'دلی والوں' جیسی ٹوپی ہے جو بے مَیل ہے اور دوسرا ننگے سر ہے اور بال الجھے الجھے ہیں اور دونوں پھر اندر آجاتے ہیں۔

میں نے چائے کا تیسرا اور آخری گھونٹ لے کر پیالی طشتری پر رکھ دی ہے اور اسے میز کے ایک طرف کھسکا دیا ہے۔

ہوٹل کا ریڈیو چیخ چیخ کر فلمی گانے سنا رہا ہے۔ اچانک وہ زور سے کھڑکھڑاتا ہے اور ہوٹل کا نوجوان مالک جو ٹھڈی (ٹھوڑی) ہاتھوں پر رکھے کسی اردو اخبار کو جانے کب سے پڑھ رہا تھا، چونک کر ریڈیو کا بٹن گھمانے لگتا ہے۔

میں ان دونوں کو دیکھ رہا ہوں جو ابھی ابھی اس ہوٹل میں داخل ہو کر بیٹھے ہیں۔ دلی والوں کی ٹوپی پہنے ہوئے شخص نے اپنے ساتھی سے کچھ مشورے کرنے کے بعد دو شیر مال اور دو سیخ کباب کا آرڈر دے دیا ہے۔ہوٹل کا لڑکا اس بڑے سے طاق نما سوراخ کے پاس کھڑا ہوا ہے جہاں سے ہوٹل کے باورچی خانے کا منظر دکھائی دیتا ہے۔

اور مولا بخش ایک کروٹ بیٹھے بیٹھے دوسرا پہلو بدل کر بیٹھ جاتا ہے اور باہر سے نظریں ہٹا کر وہ میری جانب دیکھنے لگتا ہے جیسے اسے میرے دیر تک بیٹھے رہنے پر تعجب ہو رہا ہو میں اس کی ٹٹولتی نگاہوں سے بچ کر پہلو بدلتا ہوں۔

اب میرے انتظار کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے۔جس اخبار کے ایڈیٹر نے مجھ سے یہاں ملاقات کرنے کا وعدہ کیا تھا اس کے آنے کی امید تقریباً ختم ہو چکی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ امید کی جس کرن کے سہارے میں نے تین روپے ساڑھے چودہ آنے میں پچھلے چار دن گزارے تھے وہ کرن اس ہوٹل میں جیسے گم ہو گئی۔اب تک وہ ایڈیٹر نہیں آیا۔جس نے مجھے ترجمہ کا کام دینے کا وعدہ کیا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ کام ٹھیک ہوتے ہی کچھ ایڈوانس مانگوں گا۔جس سے زکریا اسٹریٹ کے ایسے ہوٹلوں میں کم از کم چند دن کھپ سکوں۔

دلی والوں کی ٹوپی پہنے ہوئے شخص کے آگے ایک شیر مال رکھی ہوئی ہے، اوپر کا سرخی مائل حصہ بے حد اشتہا انگیز ہے اور کباب سے اٹھتا ہوا ہلکا ہلکا دھواں میں آسانی سے دیکھ سکتا ہوں۔

وہ ایڈیٹر ابھی تک نہیں آیا ہے۔اور میں سوچ رہا ہوں کہ مولا بخش کی بیوی سکینہ کیسی ہوگی؟ اس کے کوئی بچہ ہے کہ نہیں۔اور اس وقت مجھے اچانک لگا کہ میں مولا بخش سے مخاطب ہو کر پوچھوں کہ اس کے کوئی بچہ ہے یا نہیں۔ میں نے اس سوال کو مہمل اور بے موقع خیال کرتے ہوئے اپنے ذہن سے نکال دیا ہے۔

© NCERT not to be republished

اب وہ دلی والوں کی ٹوپی پہنے شخص اور اس کا ساتھی آدھی سے زائد شیر مال کھا چکے ہیں اور سیخ کباب سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو اب میں نہیں دیکھ سکتا۔ شاید اب دھواں اٹھ بھی نہیں رہا ہے۔

وہ ایڈیٹر اب نہیں آئے گا۔ میں نے چار دن یوں ہی بے کار گنوا دیے۔ ورنہ ان چار دنوں میں دوڑ دھوپ کی جا سکتی تھی۔ کوئی ٹیوشن ہی تلاش کی جا سکتی تھی۔ مگر چار روز تک اس اطمینان سے بیٹھے رہنے کے بعد ابھی اچانک اس متوقع کام سے مایوسی پر اب آگے چلنے کی جیسے صلاحیت ہی نہ رہی ہو۔

سکینہ کی عمر بیس سال سے زیادہ نہ ہوگی اور بچہ بھی کوئی نہ ہوگا۔ یہ شرافت حسین کون ہوگا؟ اور تب میں سوچتا ہوں کہ یہ شرافت حسین مولا بخش کا رشتہ دار ہوگا۔ یا پھر دوست ہو سکتا ہے۔ اور سکینہ........

اب یہ کیا تُک ہے کہ ایڈیٹر وعدہ کے خلاف اب تک نہیں آیا ہے اور مجھے سکینہ کی عمر کی پڑی ہے۔ شرافت حسین اور سکینہ کی رشتہ داری کی نوعیت کی فکر ہے۔ مولا بخش اور شرافت حسین کے تعلقات سے مجھے کیا تعلق ہے؟

اب وہ دونوں شیر مال کے بعد چائے بھی پی چکے ہیں اور کاؤنٹر پر ہوٹل کا نوجوان مالک ان سے پیسے لے رہا ہے۔

اب تین بج رہے ہیں، گیارہ بجے سے تین بجے تک انتظار کے بعد نڈھال سا ہو رہا ہوں۔

یہ مولا بخش ہر ماہ کی 13 تاریخ کو منی آرڈر ضرور لکھواتا ہے۔ ایک دو روز آگے یا پیچھے، مگر پوری پابندی سے لکھواتا ہے۔

اور میں سوچ رہا ہوں، سکینہ ضرور خوبصورت ہوگی۔ اور یہ جو مولا بخش کی آنکھوں میں چمک ہے وہ اسی جوان محبت کی چمک ہے۔ اور جو یہ چمک کسی قدر دھندلاہٹوں میں ہے وہ فراقِ یار ہے۔

تین روپے ساڑھے چودہ آنے کے تقریباً جُدا ہو جانے کے بعد ایڈیٹر نہیں آیا، تو اب کیا ہوگا— سوچ رہا ہوں، یہ جو جیب میں اب فقط ساڑھے چھ آنے ہیں، اس میں سے چھ پیسے یعنی ڈیڑھ آنے بھی جدا ہونے والے ہیں۔

میں اس پیالی کو دیکھ رہا ہوں جسے میں کب کا خالی کر چکا ہوں مگر ہوٹل کے نوکر نے اسے ٹیبل سے نہیں اٹھایا ہے۔ یہی وہ پیالی ہے جو مجھے مزید ڈیڑھ آنے سے محروم کر دے گی اور میری جیب میں پانچ آنے رہ جائیں گے۔ اور کلکتہ شہر، اور یہ زکریا اسٹریٹ، اور یہ دلکشا ہوٹل—

دل سے مانتا ہوگا مولا بخش سکینہ کو، جبھی تو— اور اب مولا بخش اپنی جگہ سے اُٹھ چکا ہے اور مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اور اب وہ میرے قریب آ گیا ہے اور کہہ رہا ہے ”ہم کل آئیں گے جی— آپ رہیں گے نا؟“ — میں اسے اثبات میں جواب دیتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ یہ کل منی آرڈر لکھائے گا اور کل صبح تک میری جیب میں پانچ آنے رہیں گے یا.....—

© NCERT not to be republished

میں اس وقت اپنی کوٹھری کی ایک چوکی پر پڑا ہوں۔ میرے سرہانے دو آنے پیسے تکیہ سے دبے پڑے ہیں۔ اور میں رات دیر تک جاگنے سے گرانی محسوس کر رہا ہوں۔

اس کلینڈر کی جانب دیکھ رہا ہوں جو ہوا سے پھڑ پھڑا رہا ہے جس میں ایک امریکن عورت جہاز کی سیڑھی پکڑے بڑے ہی قاتل انداز میں کھڑی ہے۔ امریکن کلینڈر........ میں منہ ہاتھ دھو چکا ہوں، بھوک لگ رہی ہے۔ بڑی احتیاط سے میں تکیہ ہٹاتا ہوں اور دو آنے اُٹھا کر جیب میں رکھ لیتا ہوں۔

میں سوچ رہا ہوں، ٹیوشن کی تلاش میں نکلنا بہتر ہوگا۔ کچھ سہارا ہو جائے۔ پھر اطمینان سے نوکری تلاش کروں گا۔ اور تب سوچتا ہوں کہ انگریزی کی جو ڈکشنری پڑی ہے اسے بیچ کر کچھ پیسے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس خیال سے تقویت محسوس کرتا ہوں۔

اور میرے سامنے حسین، بیڑی دوکان، پورنیہ، مولا بخش...... ساٹھ روپے۔

اب میں منی آرڈر لکھ چکا ہوں اور مولا بخش کے ساتھ ہی ساتھ کوٹھری میں تالا بند کر کے سڑک پر آ گیا ہوں۔ اور مولا بخش مجھ سے کہہ رہا ہے کہ اسے آج مالک نے جلدی ہی بلایا ہے اس لیے وہ آج منی آرڈر نہیں بھیج سکے گا۔ اور میں کچھ سوچ کر اس سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے فرصت ہے وہ کہے تو میں منی آرڈر بھیج دوں۔

''آپ—؟'' وہ ہچکچاتا ہے مگر میں اسے ہمت دلاتا ہوں کہ آخر وہ بھی آدمی ہے۔ ایک کام ہی اس کا کر دوں گا تو کیا چھوٹا ہو جاؤں گا۔

مولا بخش جا چکا ہے اور میری جیب میں ساٹھ روپے ہیں، اور منی آرڈر فارم ہے۔ اور میں ٹیوشن کی تلاش میں جا رہا ہوں۔

ابھی شام ہوگئی ہے اور میں دل کُشا ہوٹل میں نہیں ہوں، میں پارک سرکس میں ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں بیٹھا ہوں، میری میز پر ابھی ابھی بیرے نے ایک شیرمال، قورمہ اور سیخ کباب لا کر رکھا ہے اور میں بغور اس شیرمال کو دیکھ رہا ہوں جو بہت ملائم، بے حد لذیذ اور خوبصورت نظر آ رہی ہے۔

میرے ذہن میں اس ایڈیٹر کا خیال نہیں ہے جس نے مجھے ترجمہ کا کام دینے کا وعدہ کیا تھا اور گیارہ بجے سے تین بجے تک اس کا انتظار کرنے کے بعد بھی وہ نہیں آیا، اور اس وقت زیادہ سے زیادہ سات بجے ہیں۔ اس ہوٹل میں رونق بڑھتی جا رہی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اس ہوٹل تک میرے قدم کیسے آئے؟ کوئی ٹیوشن نہیں ملی، نوکری نہیں ملی۔ اور دفعتاً مجھے سکینہ کا خیال آتا ہے جس کے پاس اسی پابندی سے منی آرڈر بھیجا گیا ہے مگر جو اس کو نہیں ملے گا۔ ساٹھ روپے میری جیب میں پڑے ہیں۔ اور منی آرڈر فارم میں نے کراؤن سنیما کے سامنے پڑے ہوئے پیک کے گملے میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے ڈال دیا ہے۔

© NCERT not to be republished

میں شیر مال کھانے لگا اور مجھے خیال آیا ہے اگر میں مولا بخش سے بیس پچیس روپے مانگ لیتا تو شاید وہ دے دیتا مگر مولا بخش کے سامنے دستِ سوال بڑھانے کے خیال سے مجھے بڑی ذلت محسوس ہو رہی ہے۔

یہ کباب کتنا خوش ذائقہ ہے اور پیاز کے ان تراشوں کے ساتھ تو اس کا لطف ہی نرالا ہے۔ میں ڈلہوزی اسکوائر کے ایک آفس سے نیچے اُتر رہا ہوں۔ پانچویں منزل سے اترتے اترتے پاؤں دکھنے لگے ہیں۔ اور ایسی کتنی ہی بلڈنگوں سے نامراد لوٹتے لوٹتے اب مجھے ایسا لگتا ہے جیسے نوکری نام کی کوئی چیز اس دنیا میں نہیں ہے۔

ٹرام کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ میں فٹ پاتھ پر کھڑا اپنی تھکن کو دور کر رہا ہوں۔ میری جیب میں بائیس روپے کچھ آنے ہیں اور سکینہ کو منی آڈر ابھی تک نہیں ملا ہے۔ بائیس روپے کتنی بڑی طاقت کا مظہر ہیں۔ میں سوچتا ہوں ابھی کچھ روز اور بھی چکر کاٹ سکتا ہوں۔ بائیس روپے اب بھی میرے پاس ہیں۔

اب میں چلنے لگا ہوں اور رُخ کولوٹولہ کی طرف کر دیا ہے۔ چلتے چلتے اس بلڈنگ تک آ گیا ہوں جو جاپانی بمباری کی زد میں آئی تھی۔

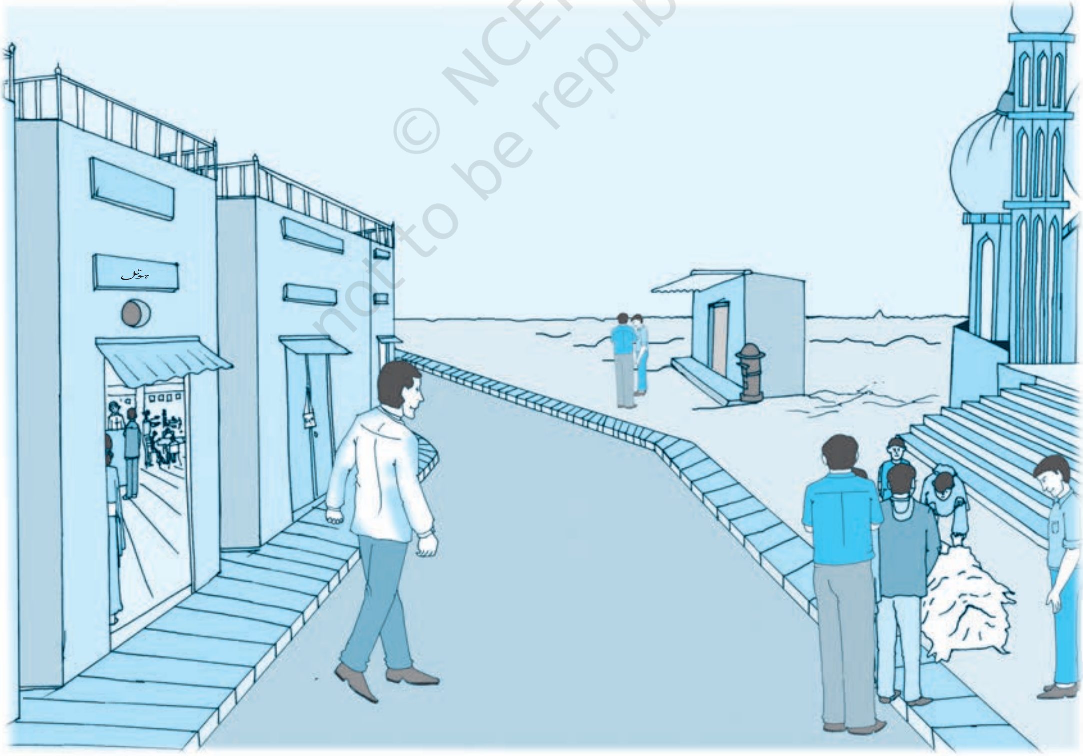

© NCERT not to be republished

میں وہاں پر آ گیا ہوں جہاں اردو رسالوں کی دوکان ہے اور میں اس سے آگے بڑھ گیا ہوں۔سکینہ کا خیال مجھے اس کوٹھی کا خیال دلاتا ہے جو تھیٹر روڈ پر ہے اور جہاں مجھے ٹیوشن کے لیے آج شام کو بلایا گیا ہے۔کیا پتہ آج ٹیوشن مل ہی جائے۔

یہ ناخدا مسجد ہے۔ وہی زکریا اسٹریٹ کے دروازے کے باہر ایک لاش اسٹریچر پر پڑی ہوئی ہے اور ایک نوجوان آواز لگا رہا ہے۔''ایک غریب مرگیا ہے،کفن دفن کے لیے پیسے دے کر ثواب حاصل کیجیے۔''

میں قریب جاتا ہوں۔ فیتے سے بند ہونے والی گنجی ایک کان کٹی ہوئی لو۔

''مولا بخش—؟'' میں ہلکے سے اس کا نام لیتا ہوں،سکینہ کے پاس منی آرڈر پہنچنے سے پہلے یہ خدا کے یہاں پہنچ گیا۔

میں اس آواز لگانے والے نوجوان سے پوچھتا ہوں،''یہ کیسے مرا؟'' ''ٹرک سے کچل کر۔'' نیچے کے دھڑ سے اس نے چادر ہٹا کر دکھایا۔ مجھے چکر آنے لگا ہے۔ یہ ناخدا مسجد ہے۔ مولا بخش ہے۔ جس کے کفن دفن کے لیے ایک آنے دو آنے راہ گیر چادر پر پھینکتے جارہے ہیں۔

میرا ہاتھ جیب میں جاتا ہے۔ بائیس روپے کچھ آنے اس چادر پر پھینک کر جلدی جلدی جانے لگتا ہوں، وہ نوجوان مجھے غور سے دیکھتا ہے۔

میں مڑ کر دیکھتا ہوں۔ وہ نوجوان مجھے اب بھی غور سے دیکھ رہا ہے۔

—— کلام حیدری

© NCERT not to be republished

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ افسانہ نگار ہوٹل میں کس کا منتظر تھا اور کیوں؟
2۔ اس کہانی میں زندگی کی کون سی سچائی بیان کی گئی ہے؟
3۔ مولا بخش کے کردار پر روشنی ڈالیے۔
4۔ اس کہانی کا عنوان سخی کیوں رکھا گیا ہے؟

رتن سنگھ

(پیدائش : 1927)

رتن سنگھ ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ وہیں انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ بعد میں دہلی چلے آئے اور کچھ عرصہ لکھنؤ میں رہے۔ ان کی پہلی کہانی ''ممّی تم ایک دیوار ہو'' 1953 میں شائع ہوئی۔ 1969 میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''پہلی آواز'' منظرِ عام پر آیا۔ اس کے بعد ان کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہوئے جن میں ''پنجرے کا آدمی''، ''مانک موتی'' اور ''کاٹھ کا گھوڑا'' شامل ہیں۔ ''صبح کی پری'' بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ انھوں نے اردو میں بعض پنجابی افسانوں اور ناولوں کے ترجمے بھی کیے۔ رتن سنگھ کا تعلق بھی ادیبوں کی اس نسل سے ہے جو ترقی پسند تحریک کے ساتھ ذہنی اور نظریاتی وابستگی رکھتے تھے۔ ان دنوں رتن سنگھ کا مستقل قیام نوئیڈا (گوتم بدھ نگر) میں ہے۔

© NCERT not to be republished

من کا طوطا

ایک دن یہ ہوا کہ میرے من کا طوطا پُھدک کر میرے جسم سے باہر آ گیا اور میرے سامنے تپائی پر بیٹھ گیا۔

”یہ کیا بھائی؟ باہر کیوں آ گئے؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”جسم کے اندر پڑا پڑا میں بڑی گھٹن محسوس کر رہا تھا، اِس لیے سوچا کہ ذرا باہر کی ہَوا کھائی جائے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ تپائی سے اُڑا اور بڑی میز پر جا کر کتابوں کے اوپر بیٹھ گیا اور ایک کتاب کو چونچ مار کر اُس نے کھول دیا۔

”ارے ارے کیا کرتے ہو؟ کتاب ہے پھٹ جائے گی۔“

”پھٹ جائے تو اچھا ہے، انھیں پڑھ پڑھ کر ہی تو تم مجھے اپنی مرضی نہیں کرنے دیتے۔ اچھا ہے، یہ بُرا ہے، یہ ٹھیک ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے......“

”ٹھیک ہی کہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

طوطے نے میری بات اَن سُنی کرتے ہوئے اُڑان بھری اور ایک پہاڑ کی تصویر کے چوکھٹے پر جا کر بیٹھ گیا۔ اُس میں ایک پہاڑی ندی پتھروں کے بیچ بہتی ہوئی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ کچھ دیر وہ ندی کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بولا ”جس طرح یہ ندی کا پانی پہاڑوں کے گھیرے میں بند ہو کر نہیں رہ سکتا اسی طرح مجھ سے بھی اب تمھارے اندر نہیں رہا جاتا۔“

”لیکن کیوں؟“

”اس لیے کہ میں نے ایک زندگی تمھارے

© NCERT not to be republished

ساتھ گزار کر دیکھ لی، تمھارے ساتھ رہ کر میری تو ایک بھی خواہش پوری نہیں ہوئی۔''

''لیکن بھائی میں وہی تو کرتا ہوں جو میں اپنی عقل کے مطابق ٹھیک سمجھتا ہوں؟''

''تمھاری عقل کی دنیا اتنی چھوٹی ہے کہ میرا اس میں دم گُھٹنے لگا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے من کا طوطا تصویر سے اُڑا اور باہر کی طرف کُھلنے والی کھڑکی پر آ کر بیٹھ گیا۔

کھلی ہوئی کھِڑکی کی روشنی میں مَیں نے اپنے من کے طوطے کی طرف غور سے دیکھا مجھے بڑا ہی خوب صورت لگا۔ گلے میں گہری نیلے رنگ کی گانی، سرخ چونچ، ہرے ہرے پنکھ جیسے......

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' من کے طوطے نے پوچھا۔

''یہی کہ تم بہت خوب صورت ہو۔''

''اور آج میرا من دنیا کی خوب صورتی دیکھنے کے لیے مچل رہا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اُس نے اُڑنے کے لیے پنکھ تولے۔

''ارے ارے کہاں جاتے ہو؟''

''میں شام تک لوٹ آؤں گا'' یہ کہتے ہوئے میرے من کے طوطے نے اُڑان بھری اور آنکھ جھپکتے میں آسمان کی کُھلی فضاؤں میں پہنچ گیا۔

یوں تو من کا طوطا کبھی بھی میرے قابو میں نہیں رہا۔ تصوّر ہی تصوّر میں یہ اَن دیکھی، اَن جانی وادیوں میں بھٹکتا رہتا تھا۔ کبھی گھنے جنگلوں کے سائے میں بھٹکتا پھرتا تو کبھی سائبیریا کے برفیلے علاقے میں پہنچ جاتا، کبھی تپتے ہوئے ریگستان میں سے گزر کر اسی نخلستان کے ٹھنڈے میٹھے سائے میں جا کر لیٹا رہتا، تو کبھی کسی پہاڑی ندی کے کنارے بیٹھ کر پانی کی مدھر قل قل کو سنتا رہتا۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی تو اندر بھگوان کی نگری میں پہنچ کر کسی سرووَر کے صاف شفاف پانی میں اَٹھکھیلیاں کرتا رہتا۔ لیکن یہ سب تصوّر ہی تصوّر میں ہوتا تھا، تصوّر ہی تصوّر میں یہ کئی قسم کے انوکھے چہرے میرے سامنے لا کر کھڑا کر دیتا۔

''یہ کون ہیں؟'' میں ٹوکتا۔

''یہ تمھارے تخیل کی اُپج ہیں۔'' من کا طوطا کہتا۔

''میرا تخیل یا تمھارا اپنا فتور؟''

''کچھ بھی سمجھو، زندگی میں تمھارا اِن سب سے رشتہ ہے۔''

''نہیں، یہ میرے کچھ نہیں لگتے۔''

© NCERT not to be republished

''کیا تم خدا کی کائنات سے باہر ہو؟'' من کا طوطا پوچھتا۔

''باہر تو نہیں ہوں، لیکن میں ان کو نہیں جانتا۔''

''اگر کائنات کے بھید جاننا چاہتے ہو تو ان سب کو دیکھو، جو میں نہیں دِکھا رہا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ایک نیا چہرہ میرے سامنے لاکر کھڑا کر دیتا۔ یا پھر آن کی آن میں کسی انجانے دیش کے انجانے شہر میں کسی پُل پر کھڑا ہو کر نیچے بہتے ہوئے دریا کا نظارہ دیکھنے میں محو ہو جاتا۔

یہ سب تو اکثر ہوتا تھا۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا جیسا اُس دن ہوا کہ وہ بذاتِ خود میرے وجود سے باہر نکل آیا اور اب پتا نہیں خدا کی کائنات میں کہاں بھٹک رہا تھا۔

اُس دن میں سارا دن پریشان رہا۔

اسی پریشانی کے عالم میں کہیں آنکھ لگ گئی تو کندھے کے نیچے میرے بازو پر پتہ نہیں کسی چیز نے کاٹ لیا۔ میرے گھر میں چوہے بہت ہیں، ادھر ادھر بھی گھومتے رہتے ہیں اور پھر کوڑھ کرلیاں بھی ہیں۔ پتہ نہیں کس نے مجھے بے سدھ پا کر کاٹ لیا تھا۔ پٹّی کر دینے سے لہو بہنا تو بند ہو گیا تھا مگر بازوؤں میں درد کافی ہوتا رہا۔

اِسی پریشانی میں کسی نہ کسی طرح شام ہو گئی۔ بازو کے درد سے زیادہ مجھے من کے طوطے کی فکر تھی، اسی لیے آسمان کی طرف آنکھیں جمائے بیٹھا تھا۔ تبھی میرے من کا طوطا دھیرے دھیرے اُڑتا ہوا آیا اور کھڑکی کے راستے سے کمرے میں داخل ہو کر تپائی پر بیٹھ گیا۔

میں نے دیکھا اُس کا حُلیہ بے رنگ ہو رہا تھا، پنکھ نُچے ہوئے تھے، چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

''کہو کیسی بیتی؟'' میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے تپائی سے اُٹھا کر ہاتھ کی ہتھیلی پر بٹھا لیا۔

کچھ دیر تک وہ اپنی سانس قابو میں کرتا رہا۔ جب اس کا دم میں دم آیا تو بولا ''آج میرے ساتھ بہت بُرا ہوا'' اور پھر اُس نے اپنی کہانی سُنانی شروع کی۔

''میں یہاں سے اُڑا تو بہت دور ایک بہت بڑے پیڑوں کے جھنڈ میں اترا، وہاں طرح طرح کے پکشی چہک رہے تھے۔ وہاں اپنے بھائی بندوں کے بیچ پہنچ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ جس پیڑ پر میں اترا تھا وہ بھی بڑا سندر تھا۔ جسم میں کچھ ٹھنڈک آئی تو میں نے چاروں طرف دیکھا۔ کبوتر، کوّے، مینا، چڑیا سبھی پُھدک رہے تھے۔ تبھی میں نے ایک ٹہنی پر طوطوں کی ایک ٹولی دیکھی۔ ان میں ایک طوطی مجھے بہت اچھی لگی۔ میرے من میں آیا کہ اس طوطی کے پاس چل کر بیٹھتا ہوں، کچھ من بہل جائے گا۔ ابھی میں

اُس کے پاس جانے کی بات سوچ ہی رہا تھا کہ ایک طوطے کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ پہلے تو وہ کچھ دیر مجھے گھور گھور کر دیکھتا رہا، مگر پھر اس نے ایسی ٹیں ٹیں شروع کی کہ اس کے ساتھ مل کر باقی طوطے بھی ٹیں ٹیں کرنے لگے۔ میری سمجھ میں ہی نہ آیا کہ ماجرا کیا ہے۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ سبھی طوطے ایک ساتھ وہاں سے اُڑے اور میری طرف جھپٹے، ان سے گھبرا کر میں ایسا دُم دبا کر اڑا ہوں کہ کچھ پوچھو نہیں۔''

''اور ان طوطوں نے تمھارا پیچھا چھوڑ دیا؟''

''مجھ سے تیز بھلا اِس دنیا میں کون اُڑسکتا ہے، پیچھا نہ چھوڑتے تو کیا کرتے۔ مگر تم بیچ میں ٹوکو نہیں'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی روداد پھر سنانی شروع کی:

''اب میں پیڑوں کے اُس جُھنڈ سے اُڑا تو اُڑتے اُڑتے ایک دریا کے کنارے پہنچا۔ وہاں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، اس لیے میں کتنی دیر تک دریا کے ساتھ ساتھ اُڑتا رہا، بڑا مزا آیا۔ آگے گیا تو دریا کے کنارے ایک بڑا ہی خوب صورت سا پیڑ اُگا ہوا دکھائی دیا۔ اس پر لگے ہوئے پھولوں سے بڑی بھینی بھینی خوش بو آ رہی تھی۔ دور سے پھول ایسے لگ رہے تھے جیسے آسمان کے ستارے پیڑ پر بیٹھ کر دریا کے بہتے ہوئے پانی کو دیکھ کر من بہلا رہے ہوں۔

میں جلدی جلدی پنکھ مارتا ہوا جب اُس پیڑ کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس پیڑ کے نیچے ایک بہت ہی خوبصورت عورت گہرے آسمانی رنگ کی ساڑی پہنے اپنے دھیان میں مگن دریا کی لہروں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں جلدی سے زمین پر اُترا اور طوطے کا جامہ چھوڑ کر انسانی جامہ پہن لیا اور اپنے ذہن میں بہت سے حسین سپنے بُنتا ہوا اُس پیڑ کی طرف چلنے لگا۔ ابھی میں اُس سے دس پندرہ قدم دوری پر ہی تھا کہ اس عورت کی باندی نے میرا راستہ روک دیا۔''

''مالکن کے پاس جانے کی کسی کو اجازت نہیں۔''

''کیوں، کیا بات ہے؟''

''دیکھتے نہیں، وہ اپنے محبوب کی یاد میں کس طرح ڈوبی ہوئی ہیں۔''

''کون ہے ان کا محبوب؟'' میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

''دیکھا تو اس کو انھوں نے بھی نہیں، بس ایک بار سپنے میں آیا تھا۔''

''ہوسکتا ہے وہ میں ہی ہوں، ہوسکتا ہے وہ میری ہی باٹ دیکھ رہی ہوں۔ میں بھی ایسے سپنے بہت دیکھتا ہوں'' یہ کہتے ہوئے میں نے آگے قدم بڑھانا چاہا تو اونچے پھن لہراتے ہوئے دو سانپوں نے میرا راستہ روک دیا۔

© NCERT not to be republished

میں نے ڈر کر جھٹ سے اپنا قدم واپس لے لیا تو وہ سانپ بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

''میری مالکن کے پاس جا کر قسمت آزمانا چاہتے ہو تو پہلے تمھیں اس بستی میں جانا ہوگا۔'' باندی نے دریا سے تھوڑا ہٹ کر بسی ہوئی ایک بستی کی طرف اشارہ کیا۔'' وہاں ہاٹ لگی ہوئی ہے، ہیرے موتی بِک رہے ہیں، چمکتے دمکتے زیور بِک رہے ہیں، خوب صورت مکان بِک رہے ہیں، یہ سب خرید کر آؤ تو تمھیں چند قدم دریا کے کنارے چلتے ہوئے مالکن سے بات کرنے کا موقع مِل جائے گا۔ اور اب جو میں کہہ رہی ہوں اُسے دھیان سے سنو۔ اگر دریا کے کنارے چلتے ہوئے ریت پر بننے والے تمھارے پاؤں کے نشان پانی کی لہروں سے مٹے نہیں تو مالکن سمجھ جائے گی کہ تم ہی اس کے سپنے والے محبوب ہو۔''

''یہ پاؤں کے نشان نہ مٹنے کا کیا راز ہے؟''

''کوئی راز نہیں، سپنے میں جو محبوب اس کے پاس آیا تھا، اُس نے اپنی یہی نشانی بتائی تھی۔''

''یہ کہ دریا کے کنارے جب وہ مالکن کے ساتھ چلے گا تو اس کے پاؤں کے نشان مٹیں گے نہیں؟''

''ہاں''

میں نے ایک نظر بھر کر مالکن کی طرف دیکھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے مینکا اور اروشی اِندر کا دربار چھوڑ کر اس دھرتی پر آ گئی ہوں، یا پھر وہ اسی دھرتی کا سب سے خوب صورت پھول تھی۔

مجھے اُس کی خوب صورتی میں گم ہو کر بُت بنتے دیکھ کر اس کی باندی نے جھنجھوڑا ''اگر تمھیں کوشش کرنی ہے تو جلدی جاؤ، تم سے پہلے بھی کئی لوگ جا چکے ہیں۔ اگر وہ سب کچھ حاصل کر کے پہلے لوٹ آئے تو تم ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔''

میں نے سوچا قسمت آزمانے میں کوئی حرج نہیں اور فوراً چل دیا۔

جب میں اس بستی میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بازار میں بڑی گہما گہمی ہے۔ پہلی ہی ہاٹ پر ہیرے، موتی اور سونے کے سکّوں کا بہت بڑا ڈھیر لگا ہوا تھا اور اس کا مالک ایک ایسا آدمی تھا جس کی گردن کے اوپر آدمی کے سر کے بجائے سانپ کا پھن لہرا رہا تھا۔

''یہ دھن دولت کا ڈھیر کتنے کا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''دھن دولت کی قیمت دھن تو ہو ہی نہیں سکتا۔'' دوکان دار نے اپنی دو پھاڑ زبان کو لہراتے ہوئے کہا۔

''تو پھر یہ کیسے مِل سکتا ہے؟''

''مل سکتا ہے، بڑی آسانی سے مل سکتا ہے۔''

© NCERT not to be republished

''بتاؤ تو کیسے؟''

''صرف ایک بار اپنے بازو پر مجھے کاٹ لینے دو، یہ ساری دولت تمھاری ہو جائے گی۔''

سانپ کے کاٹنے سے مجھے درد تو بہت ہوا لیکن میں نے وہ دولت کا ڈھیر حاصل کر لیا۔

اس کے ساتھ ہی ایک آدمی کہ جس کا چہرا جونک جیسا تھا، زیور بیچ رہا تھا۔ اس کی شرط یہ تھی کہ جو بھی اسے ایک بار پیٹ بھر خون چوس لینے دے گا، اسے وہ سارے زیور دے دے گا۔

میں نے جلدی سے جونک سے اسی جگہ سے خون چُسوا لیا جہاں سانپ نے کاٹا تھا اور اس طرح میں نے سارے زیور حاصل کر لیے۔ اب مکان کی کسر رہ گئی تھی۔ اتفاق سے اگلا دوکان دار مکان ہی بیچ رہا تھا۔ جب وہ مجھے اپنا مکان دکھا رہا تھا تو اس کے چہرے پر کوئل کا چہرہ تھا اور اس کی آواز بڑی سریلی اور میٹھی تھی۔ لیکن جب مکان مجھے ہر لحاظ سے پسند آ گیا اور دام طے کرنے کی نوبت آئی تو اس دوکان دار نے اپنی گردن سے کوئل کا چہرہ اُتار کر اس پر عقاب کا چہرہ لگا لیا۔ اُف کتنی بھیانک تھی اس کی وہ شکل، اس کی گول گول آنکھوں میں تو جیسے خون اُتر آیا تھا۔

وہ بولا ''یہ دھن دولت اور زیور سب کچھ ایک طرف رکھ دو اور آسمان پر اڑتے ہوئے ان پکشیوں کو گنو۔ اگر تم نے صحیح گن دیا تو مکان کے ساتھ ساتھ روپیہ پیسہ اور زیور سب کچھ تمھارا ہو جائے گا۔ لیکن اگر گنتی غلط ہوگئی تو مکان تو ملے گا نہیں، اپنے دھن دولت سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔''

میں نے اس کی شرط مان لی اور پکشی گن کر کہا ''بیس۔''

''نہیں، اکیس۔ اور اس نے مجھے اکیس پکشی گنوا کر میرا سارا دھن دولت سمیٹ لیا۔

اس طرح میں نے پانچ بار سانپ کو کٹوایا، پانچ بار جونک سے لہو چُسوایا۔ لیکن ہر بار یہ ہوتا کہ پکشی گنتے وقت مجھ سے غلطی ہو جاتی۔ میں گنتا اکیس تو پکشی بائیس نکلتے، میں کہتا تیئیس تو پکشی چوبیس نکلتے۔

آخر چھٹی بار مکان کے مالک کو مجھ پر ترس آ گیا، ویسے بھی وہ اپنے مکان کے پانچ گُنا دام تو مجھ سے وصول کر ہی چکا تھا، اس لیے اس نے کہا ''تیرا عشق سچّا ہے تیری ضرورت بھی بڑی ہے، اس لیے پکشی گِنے بغیر ہی میں مکان تم کو دیتا ہوں۔''

بس پھر کیا تھا میں اپنا دھن دولت اور زیور اس مکان میں رکھ کر اُلٹے پاؤں دریا کے کنارے پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ نہ تو وہ پھولوں سے لدا پیڑ ہی مجھے دکھائی دیا اور نہ ہی وہ پھول سی عورت ہی وہاں موجود تھی۔

جہاں تک میری نظر جاتی تھی دریا کا پانی تھا جو قل قل کرتا ہوا حدِ نظر تک بہتا چلا جا رہا تھا۔ میں بہت دیر تک وہاں مایوس سا

© NCERT not to be republished

کھڑا رہا۔

آخر سوچا واپس ہی چلوں۔

تبھی دریا کے کنارے پر میری نظر گئی۔ کسی کے پاؤں کے گہرے نشان بستی کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

''تو اس عورت کو اس کا محبوب مل گیا۔'' میں نے سوچا۔

میری نظر ان قدموں کے نشانوں کا پیچھا کرتی ہوئی بستی کی طرف اُٹھی تو مجھے لگا جیسے میرے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکتی جا رہی ہو۔

دور دور تک کسی بستی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ بس ایک چٹیل میدان تھا جو اُفق تا اُفق پھیلتا چلا گیا تھا۔

اب حیران ہو کر یہ دیکھتا ہوں کہ میرے پاؤں کے نیچے زمین بھی ہے یا نہیں تو پایا کہ زمین تو ہے مگر وہ دریا اور اس کا قل قل کرتا پانی غائب ہے۔

میں کسی جادونگری میں پہنچ گیا ہوں۔ میں نے سوچا اور گھبرا کر جلدی سے اپنے انسانی جامے کو وہیں چھوڑا۔ پھر وہی من کا طوطا بن کر اڑان بھری، اب تمھارے پاس آ گیا ہوں۔''

میرے من کے طوطے کی کہانی ختم ہوگئی تو اس نے اپنی گردن یوں نیچے ڈال دی جیسے بہت تھک گیا ہو۔

ایک ہی ہتھیلی پر اسے بٹھائے ہوئے میرا بازو بھی تھک گیا تھا، اس لیے میں اسے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر بٹھانے لگا تو بازو میں درد کے مارے میری چیخ نکل گئی۔

''کیوں کیا ہوا؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔

''جہاں تم نے سانپ سے کٹوایا تھا وہاں درد ہو رہا ہے۔''

''تب تو بہت سا خون بھی شریر سے نکل گیا ہوگا؟''

''ہاں، جونک چھ چھ بار چوسے گی تو وہ کچھ تو ہوگا ہی۔''

''مجھے واقعی بڑی شرمندگی ہے'' من کے طوطے نے کہا، اور اس نے ایک مرتبہ پھر گردن نیچے ڈال دی۔

''تمھیں آرام کی ضرورت ہے۔'' میں نے اسے ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہے تو'' یہ کہتے ہوئے من کا طوطا فوراً جسم میں داخل ہوگیا۔

اگلے دن صبح ہوئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ پھر پہلے کی طرح نو بہ نو، تازہ بہ تازہ میرے جسم سے نکل کر میرے سامنے تپائی پر

© NCERT
not to be republished

بیٹھ گیا، پھر اسی طرح پُھدکتا ہوا پہاڑ کی تصویر کے پاس گیا اور پھر وہاں سے مجھے کچھ کہے بغیر کھڑکی کے راستے باہر نکل گیا۔

تب سے میرے من کے طوطے کا یہی حال ہے۔ پتہ نہیں زندگی کی کون کون سی کششیں ہیں جو میرے من کے طوطے کو اپنی طرف بلاتی ہیں، پتہ نہیں کیسے کیسے میٹھے سپنے اپنے دل میں سموئے ہشاش بشاش وہ گھر سے روز نکلتا ہے اور ہر شام تھکا ہارا، مایوس اور اُداس واپس لوٹ آتا ہے۔

اپنے من کے طوطے کی نئی درد بھری داستان سننے کے لیے میں ہر شام تیار رہتا ہوں۔

_____ رتن سنگھ

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ مصنّف نے 'من کا طوطا' سے کیا مراد لی ہے؟

2۔ ''تمھاری عقل کی دنیا اتنی چھوٹی ہے کہ میرا اس میں دم گھٹنے لگا ہے'' طوطے نے ایسا کیوں کہا؟

3۔ ہر شام مایوس لوٹنے کے بعد بھی من کا طوطا ہر صبح گھر سے کیوں نکل جاتا ہے؟

© NCERT not to be republished

جیلانی بانو

(پیدائش:1933)

جیلانی بانو کا اصل وطن بدایوں (اترپردیش) ہے۔ ان کے والد حیدرآباد(آندھرا پردیش) جاکر بس گئے اور یہیں ان کی پیدائش ہوئی۔

جیلانی بانو کا پہلا افسانوی مجموعہ ''روشنی کے مینار'' 1958 میں شائع ہوا۔ ''نروان'' اور ''کُن'' اُن کے دوسرے افسانوی مجموعوں کے نام ہیں۔ انھوں نے کئی ناولٹ بھی لکھے جن میں '' جگنو اور ستارے'' اور '' نغمے کا سفر'' کے نام نمایاں ہیں۔ان کے دو ناول ''ایوانِ غزل'' اور ''بارش سنگ'' بہت مقبول ہوئے۔

جیلانی بانو کے افسانوں اورناولوں کا اصل موضوع حیدرآباد کے زوال کے بعد جاگیرداروں کی بکھرتی ہوئی زندگی ہے۔انھیں زبان وبیان پرقدرت ہے۔اس کے علاوہ وہ حیدرآباد کی مخصوص بولی کا استعمال بھی بڑی چابکدستی سے کرتی ہیں۔

© NCERT not to be republished

5019CH09

دوشالہ

آخر سرور کے سمجھانے بُجھانے سے امّاں جان کا دل ہار ہی گیا۔ اُن کا دل جواب اتنا بوڑھا ہو چکا تھا کہ مدافعت کی سکت ہی نہ رہی تھی۔ اور وہ دن آن پہنچا کہ ان کا ٹوٹا پھوٹا صندوق رسیّوں سے جکڑا دالان میں رکھا تھا۔ سرور نے اس کے اوپر سُتلی سے بندھا ہوا بستر، ایک لوٹا، ناشتے دان اور پان دان لاکر رکھ دیا تھا۔ بہو نے انھیں اپنا پُرانا بُرقع ٹھیک ٹھاک کر کے دے دیا۔ اس عمر میں انھیں اپنا چاند سا چہرہ چمکانے کے لیے اب سیاہ برقع کی تو ضرورت نہ تھی۔

گھِسی ہوئی آدھی سلیم شاہی جوتیاں انگوٹھوں میں اٹکائے وہ سارے گھر میں سٹر پٹر کرتی پھر رہی تھیں۔ اپنی سٹھیائی ہوئی یادوں کو اکٹّھا کر کے بار بار سوچتیں کہ ابھی کون کون سی چیزوں کی اُٹھا دھری کرنی ہے؟ اُن پر وہ وحشت سوار ہو چکی تھی جو سفر کا آغاز ہوتی ہے۔

اِدھر اُنھوں نے کمرے سے باہر قدم رکھا اُدھر ان کا پوتا توقیر اور اس کی بہن جمال کوٹھری کا جائزہ لینا شروع کر دیتے تھے۔ وہاں کی ہر چیز اماں جان کے کام کی تھی۔ مکڑی کے جالے بھرے، ٹوٹے پھوٹے سامان کے ڈھیر پر وہ مایا کا سانپ بنی بیٹھی تھیں۔ جمال محض انھیں ستانے کے لیے اگر زمین پر سے پان کا ڈنٹھل بھی اُٹھا لیتی تھی تو وہ چونک پڑتیں۔

''اے بیٹا کیا لیے جائے ہے۔ وہ میرے کام کی ہے۔'' اب انھیں دور سے سوجھائی تھوڑی دیتا تھا۔ بس یوں ہی الل ٹپ کہہ دیتیں۔

''یہ پان کا ڈنٹھل بھی۔۔۔؟'' جمال بُرا مان کر دکھاتی۔۔۔

''دیکھوں۔۔۔'' وہ اس کی ہتھیلی اپنی آنکھوں سے لگا کر یقین کر لیتیں۔

''مگر تجھے ہر چیز اُٹھانے کا لپکا کیوں ہے۔۔۔؟''

ان کا جی ڈوب جاتا تھا۔ ان بچّوں کی وجہ سے تو ہر وقت ان کی گردن پر تلوار لٹکتی رہتی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ انھیں اپنے پوتے اور پوتی سے نفرت ہو۔ مگر جن کے پاس دولت ہو اس کا دل تو دھڑکا ہی کرتا ہے۔ ہر طرف ڈاکوؤں کے پڑاؤ نظر آتے ہیں۔ ان کے چار بڑے لڑکے ایک لڑکی سمیت پاکستان سِدھار چکے تھے۔ ایک سرور تھا کہ کلرکی پر قناعت کیے، باپ دادا کی اس پرانی

© NCERT not to be republished

حویلی میں چراغ جلا رہا تھا۔ اس حویلی کی بھی امّاں جان کی طرح کمر جھک چکی تھی اور دانت بھی ٹوٹ گئے تھے۔ دراصل سرور کی بیوی نہ چاہتی تھی کہ وہاں بھی چار جٹھانیاں اور ایک ساس ہر وقت اُسے بہو بہو پکار کر اس کی گردن جھکائے رکھیں۔ مگر امّاں جان گھر نہ چھوڑنے کے بہانے اب بھی آنکس سنبھالے اس کی گردن پر سوار تھیں۔

ویسے گھر سے مراد اب صرف ان کی کُٹھریا تھی۔ جوں جوں گھر پر بہوؤں اور ان کی اولاد کا قبضہ ہوتا گیا وہ پیچھے ہٹتی گئیں۔ یہاں تک کہ اب اس ٹپکتی چھت کی سیلی کوٹھری پر ان کی اجارہ داری رہ گئی تھی، وہاں انھوں نے ہر وہ چیز جمع کر رکھی تھی جو ان کی بہوؤں کے خیال میں پھینک دینے کے قابل تھی۔ وہاں ان کی زندگی کے سارے ٹوٹے پھوٹے زنگ آلودہ کل پُرزے پڑے تھے۔ ٹوٹے ہوئے فانوس کے رنگین ٹکڑے۔ زندگی بھر ساری تقریبوں میں سِیے جانے والے کپڑوں کی کترنیں۔ اُن بچّوں کے کھلونے جن کے بچّے بھی اب کھلونوں سے نہیں بہلائے جا سکتے۔ یہ سب دولت انھوں نے لکڑی کے صندوقوں میں اتنی احتیاط سے چھپا رکھی تھی جیسے حنوط کر کے اپنی یادوں کی ممیاں سجا رکھی ہوں۔ اس میں وہ زربفت کی اچکن تھی جو امّاں جان کے ابّا نے دولھا بنتے وقت پہنی تھی اور ان سچّی چینی کی رکابیوں کے ٹکڑے تھے جو ان کی امّاں اپنے جہیز میں لائی تھیں، ان کے ابا کا فرغل تھا اور ان کے دادا کا تاریخی دوشالہ۔

جس وقت وہ ساری بازیاں ہار کے زندگی کے ناپیدا کنار سمندر میں غوطے لگا رہی تھیں تو اس دوشالے کی محبت گُم شدہ جزیرے کی طرح پالی تھی، ان کی اندھیری کوٹھری میں وہ ہزار کینڈل پاور کا بلب تھا جس کی روشنی میں کوئی راہ کٹھن نہ لگتی تھی۔

دوشالے کا کپڑا ہر ہر تہہ پر سے پاپڑ کی طرح ٹوٹ چکا تھا۔ مگر اس کے کارچوب میں سے کئی سیر چاندی نکالی جا سکتی ہے...... یہ بات ایک دن بیوی نے سرور کو سمجھائی۔

اور دوسرے دن امّاں جان اپنے بیمار بھتیجے کو دیکھنے گئیں تو وہ دوشالہ بڑی احتیاط سے نکالا گیا۔ بہو نے اس کی جگہ اپنی پرانی رضائی رکھ کر سات گٹھریوں کی تہیں پکّے ٹانکوں سے سیں۔ اُسی طرح سے پُرانا ازار بند اوپر سے لپیٹ کر صندوق میں رکھا اور صندوق کے اوپر سب گٹھریاں، پوٹلیاں، افیون کی ڈبیہ، دواؤں کی شیشیاں اور بالائی کا دونا ہر چیز یوں جمائی کہ سوائے گرد کے کوئی چیز اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ امّاں جان کی آنکھوں میں اب اتنا دم کہاں تھا کہ روز روز پکّے ٹانکے اُدھیڑ کر دوشالے کو زمانے کی ہوا سے میلا کرتیں۔ اس لیے وہ بڑے اطمینان سے بہو کی پُرانی رضائی سینے سے لگائے جیے جا رہی تھیں۔ رات رات بھر جاگ کر اس کی حفاظت کرتیں۔ بات بات پر اونچی ہو کر بہو کو جواب دیتیں۔ بلا سے ان کا بیٹا ایک ایک پیسے کو ترسائے۔ وہ چاہیں تو آج اپنے دادا کا دوشالہ بیچ کر ٹھاٹ کریں۔ اس دوشالے کی حفاظت کے لیے ان کے سارے بھولے بسرے خواب چوکھٹ پر دھرنا دیے بیٹھے

© NCERT not to be republished

رہتے تھے۔ اگر ذرا سی لاپروائی سے خدانخواستہ دوشالہ کھو جائے تو اس کے ساتھ امّاں جان کا بچپن کھو جاتا، بیاہی زندگی کی اذیّت ناک مٹھاس اور بڑھاپے کی تسکین آمیز کڑواہٹ....توبہ ہے۔ اب اتنی لاشوں پر رونے کے لیے آنسو کہاں سے آئیں گے۔ اسی لیے تو انھیں اپنے پانچ بچّوں کو ان کی اولاد سمیت بھول جانا پڑا تھا۔ وہاں سے جس کا خط آتا امّا جان کے لیے تڑپ رہا ہے۔ انھیں کیا معلوم کہ امّاں پر کس کی محبت خدائی کر رہی ہے....! وہ....تو....اپنی دانست میں چھوٹے بیٹے کی محبت کے طعنے دیتے تھے۔ یا پھر امّاں جان سے اپنا وطن نہیں چھوڑا جاتا۔ اب یہ کون جانتا تھا کہ اگر کوئی ان کی گٹھریا اٹھا کر دوزخ میں رکھ دے تو وہ وہاں بھی اسی سکون کے ساتھ صندوق سے پیٹھ لگائے تسبیح پڑھے جائیں گی۔ دن بھر میں صرف دو تین بار کسی خاص ضرورت کے لیے کھلے آسمان تلے سے گُزرتی تھیں۔ اُن کی بلا سے یہ آسمان ہندوستان کا ہو یا پاکستان کا۔

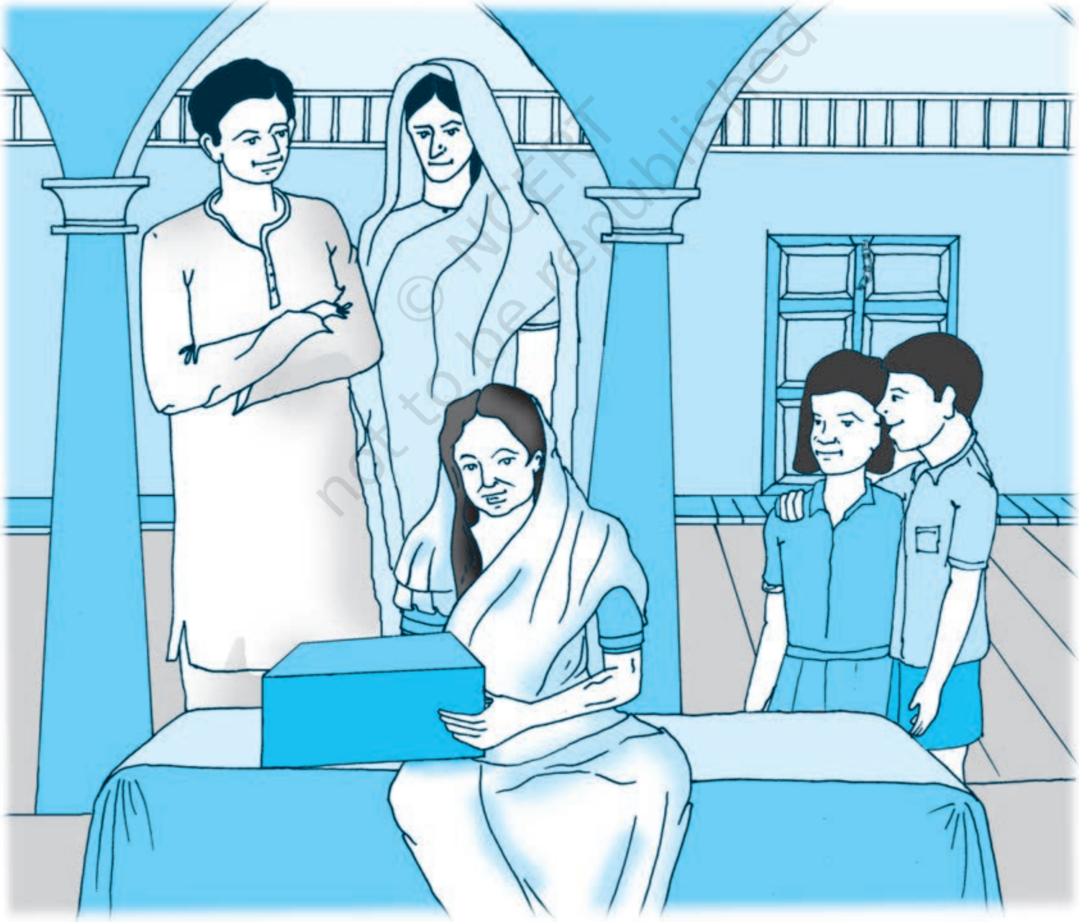
© NCERT not to be republished

کبھی کبھی جمال ان کا پلّو پکڑ کر ٹھنکنے لگتی۔ ’’دادی! ہمیں لکڑ دادا کا دوشالہ دکھایئے۔‘‘

’’اچھا اچھا کسی دن دکھا دوں گی۔‘‘ وہ ٹال جاتیں کیوں کہ سامان کھول کر بیٹھتی تھیں تو جمال اور توقیر چھینا جھپٹی شروع کر دیتے تھے۔ کوئی فانوسوں کے شیشے لیے بھاگا جا رہا ہے۔ کوئی مٹّی کی ٹوٹی گڑیا پار کرنے کی فکر میں ہے۔ گھبرا کر وہ صندوق بند کر دیتی تھیں۔ اگر یوں سخی داتا بن کر بیٹھتیں تو یہ گنجہائے گراں مایہ کیسے جمع ہو پاتے۔ نوادرات جمع کرنا کیسا جان جوکھم کا کام ہے۔ یہ تو کچھ وہی جانتا ہے جس نے امّاں جان کی طرح اپنا عیش و آرام تج دیا ہو۔

وہ تو زندگی کے بچے کُھچے دن بھی اسی طرح گزارنے کا پکّا ارادہ کیے بیٹھی تھیں کہ اُن کے بڑے بیٹے کا خط آیا۔ ان کی بڑی پوتی کا بیاہ طے ہو چکا تھا۔ اگر اب بھی امّاں جان نہ آئیں تو پھر کبھی نہ آئیں۔ ان کے بیٹے سمجھتے تھے کہ امّاں ٹوٹے ٹھیکروں کے نیچے سونے کی اینٹیں چھپائے بیٹھی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی دن امّاں کے سو جانے کا تار آ جائے اور سرور کے نصیب جاگ اُٹھیں۔ کوٹھریا کی دولت زندگی کی طرح پیاری تھی مگر زندگی تو نہ تھی۔ کیا معلوم کل کلاں کو ان کی آنکھیں پٹ سے بند ہو جائیں اور اُن کے بچّے پاکستان میں بیٹھے انھیں پکارتے رہ جائیں۔

انھیں سمجھانے کے لیے حالات اپنی دلیلیں لے کر آئے اور وہ بے بس ہو گئیں۔ سرور کو تو اللہ میاں نے چھپّر پھاڑ کر موقع دیا تھا۔ لُپائیں چھپائیں پاسپورٹ تیار کروا لایا۔ ساتھ کے لیے ایک دوست بھی ڈھونڈ دیا۔ بہو نے آناً فاناً سامان تیار کر کے دالان میں رکھ دیا۔ مارے محبت کے امّاں جان کے لیے خالص گھی کی کہہ کر بناسپتی میں کھجوریں بھی تل دیں۔

امّاں جان نے دوشالہ جیسی قیمتی چیز ساتھ لے جانا مناسب نہ سمجھا۔ کون جانے وہاں ان کے بیٹے اُلٹی سیدھی پٹّی پڑھا کر دوشالہ ہتھیا لیں تو....! اور جو کچھ صندوق میں بھرا جا سکا ٹھونس لیا۔ جب انھوں نے ایک بھرپور نگاہ ڈال کر کوٹھری کو تالا لگایا تو آنکھوں سے سیلاب اُمڈ پڑا۔ جیسے انھوں نے زندگی کی ساری بازیاں، سب جیتیں اندر بند کر دی ہوں۔ پھر وہ بہو سے لپٹ کر خوب روئیں۔

’’اب یہ کوٹھری تمھارے حوالے کر رہی ہوں۔ میرے بعد تم ہی اس کی مالک ہوگی۔‘‘

یہ بات اُنھوں نے بڑے سوچ بچار کے بعد کہی تھی۔ تاکہ بہو ابھی سے بے صبر نہ ہو جائے۔

’’دادی آپ لکڑ دادا کا دوشالہ کون سے صندوق میں رکھے جا رہی ہیں......؟‘‘ توقیر نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

’’خبردار جو دادی کو جاتے وقت ستایا۔‘‘ بہو نے اس کے دو تھپّڑ لگائے اور امّاں جان کو قسم کھا کر یقین دلایا کہ وہ کوٹھری کی کوئی چیز نہ چھوئیں گی۔

ریل میں بیٹھیں تو ان کا جی بالکل ہلکا تھا۔ انھوں نے کوٹھری میں یہ موٹا علی گڑھ کا تالا ڈالا تھا۔

صرف تین مہینے کی تو بات ہے۔ انھوں نے غیرارادی طور پر ازار بند میں کُنجی ٹٹولی۔

بمبئی پہنچ کر ایک ہفتہ ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا۔ سرور کے دوست نے جانے کیا مشکل سا نام بتایا کہ امّاں جان کا ''وہ'' نہیں بنا ہے۔ آخر اللہ اللہ کر کے تھکی ہاری امّاں جان جہاز میں سوار ہوئیں۔ تب سرور کے دوست نے جیب میں سے ایک پوسٹ کارڈ نکال کر انھیں سُنایا۔ یہ پوسٹ کارڈ اُن کے پوتے توقیر نے بڑی نستعلیق اردو میں لکھا تھا۔

دادی جان۔ سلام الیکم اور قدم بوسی

یہاں سب خیریت ہے اور آپ کی خیریت نیک مَتلوب۔ دیگر اہوال یہ ہے کہ جناب لکڑ دادا صاحب کا دوشالہ کہیں نہ ملا۔ میں نے اور جمالو نے سارا کمرہ چھان مارا۔ براکرم بواپسی ڈاک مُتلّے فرمایئے کہ آپ دوشالہ کہاں رکھ گئی ہیں......!

جمالو آپ کو سلام لکھوا رہی ہے۔ فقط

آپکا خادم

توقیر مرزا۔ متعلّم جماعت پنجم (الف)

بقلم خود

خط سُنانے کے بعد سرور کے دوست نے دیکھا کہ امّاں جان اُس دوشالے کی تلاش میں کہیں جا چکی ہیں۔ تعجب کے مارے ان کا منھ کُھلا رہ گیا تھا اور مُٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں........ جیسے وہ دوشالے کو پکڑے لٹکتی رہ گئی ہوں......

—— جیلانی بانو

سوالوں کے جواب لکھیے :

1۔ امّاں جان کو دوشالے سے لگاؤ کیوں تھا؟

2۔ امّاں جان دوشالے کی حفاظت کے لیے کیا کیا تدبیریں کرتی تھیں؟

3۔ ''ان کی اندھیری کوٹھری میں وہ ہزار کینڈل پاور کا بلب تھا جس کی روشنی میں کوئی راہ کٹھن نہ لگتی تھی'' اس جملے کی وضاحت کیجیے۔

4۔ توقیر کا خط صحیح الفاظ کے ساتھ لکھیے۔

© NCERT not to be republished

خاکہ

اصطلاحی معنٰی میں لفظ ''خاکہ'' انگریزی لفظ اسکیچ(Sketch) کا ترجمہ ہے۔خاکے سے مراد ایک ایسی نثری تحریر ہے جس میں کسی شخصیت کی منفرد اور نمایاں خصوصیات کو اس انداز سے بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی مکمّل تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔اس کے لیے خاکہ لکھنے والے کا اُس انسان کی شخصیت سے نہ صرف متاثر ہونا ضروری ہے بلکہ اُس سے واقفیت اور قربت بھی لازمی ہے۔خاکہ نگاری سوانح نگاری سے مختلف ہے۔اس میں سوانح حیات کی طرح واقعات ترتیب وار نہیں لکھے جاتے اور نہ ہی تمام حالات و واقعات کا بیان کرنا ضروری ہوتا ہے۔خاکہ نگار اسی شخصیت کا خاکہ لکھتا ہے جس سے وہ کسی نہ کسی طور پر متاثر ہوتا ہے لیکن اس کی تحریر سے مرعوبیت ظاہر نہیں ہونی چاہیے۔اُس کا بیان ایسا ہونا چاہیے کہ وہ غیر جانبدار نظر آئے۔اس لیے یہ ضروری ہے کہ خاکے میں شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو بیان کیا جائے۔جس طرح خوبیوں کا بیان مرعوبیت سے پاک ہونا چاہیے اسی طرح خامیوں کے بیان میں ذاتی دشمنی وعناد کا پہلو نہیں آنا چاہیے خامیوں کے بیان میں بھی اپنائیت کا احساس نمایاں ہونا چاہیے۔

© NCERT not to be republished

مولوی عبدالحق

(1870 – 1961)

بابائے اردو مولوی عبدالحق مغربی اترپردیش کے قصبہ ہاپوڑ میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم وطن ہی میں حاصل کی۔1894 میں ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ سے بی۔اے پاس کیا۔مختلف عہدوں پر فائز رہے۔انجمن ترقی اردو کے سکریٹری مقرر ہوئے اور زندگی بھر اردو زبان کی خدمت میں مصروف رہے۔انجمن کی جانب سے اُن کی ادارت میں سہ ماہی ادبی رسالہ ''اردو'' جاری ہوا۔ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں الہ آباد یونیورسٹی نے ایل ایل۔ڈی اور علی گڑھ یونیورسٹی نے ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگریاں دیں۔

مولوی عبدالحق محقق، سوانح نگار، خاکہ نگار، لغت نویس، ماہرِ قواعد اور صاحبِ طرز انشاپرداز تھے۔زبان سادہ اور پُر اثر لکھتے تھے۔انھوں نے کئی کتابیں لکھیں اور مرتب کیں۔ان کا سب سے بڑا کارنامہ دکن اور شمالی ہندوستان کے قدیم ادبی سرمائے کی بازیافت ہے۔اس طرح بہت سی بیاضیں اور رسالے ضائع ہونے سے بچ گئے۔

ہندوستان اور پاکستان میں اردو زبان کی اشاعت کے سلسلے میں مولوی عبدالحق کی خدمات بے مثال ہیں۔

© NCERT not to be republished

5019CH10

گدڑی کا لال۔نور خاں

لوگ بادشاہوں اور امیروں کے قصیدے اور مرثیے لکھتے ہیں۔ نامور اور مشہور لوگوں کے حالات قلم بند کرتے ہیں۔ میں ایک غریب سپاہی کا حال لکھتا ہوں اس خیال سے کہ شاید کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولت مندوں، امیروں اور بڑے لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہوسکتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر غریب کا کوئی فرق نہیں ہے

پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی ایک شان ہے

نور خاں مرحوم کنٹنجنٹ کے اوّل رسالے میں سپاہی سے بھرتی ہوئے۔ انگریزی افواج میں حیدر آباد کی کنٹنجنٹ خاص حیثیت اور امتیاز رکھتی تھی۔ ہر شخص اس میں بھرتی نہیں ہوسکتا تھا، بہت دیکھ بھال ہوتی تھی۔ بعض اوقات نسب نامے تک دیکھے جاتے تھے تب کہیں جا کر ملازمت ملتی تھی۔ کوشش یہ ہوتی تھی کہ صرف شرفا اس میں بھرتی کیے جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ کنٹنجنٹ والے عزّت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ لیکن بعد میں یہ قید بھی اُٹھ گئی اور اس میں اور انگریزوں کی دوسری فوجوں میں کوئی فرق نہ رہا۔ پہلے زمانے میں سپاہ گری بہت معزّز پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ اب اس میں اور دوسرے پیشوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔ بات یہ ہے کہ اشراف کا سنبھالنا مشکل کام ہے۔ اس میں ایک آن بان اور خودداری ہوتی ہے جو بہادری اور انسانیت کا اصل جوہر ہے، ہر کوئی اس کی قدر نہیں کرسکتا۔ اس لیے شریف روتا اور ذلیل ہنستا ہے۔ یہ جتنا پھیلتا ہے وہ اتنا ہی سکڑتا ہے۔ کرنل نواب افسر الملک بہادر بھی نور خاں مرحوم ہی کے رسالے کے ہیں۔ کنٹنجنٹ کے بہت سے لوگ اکثر تو کرنل صاحب موصوف کے توسّط سے اور بعض اور ذرائع سے حیدر آباد ریاست میں آکر ملازم ہوگئے۔ ان میں بہت سے نواب، کرنل، میجر، کپتان اور بڑے بڑے عہدے دار ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کوئی نور خاں بھی ہے؟

اوّل رسالے کے بعض لوگوں سے معلوم ہوا کہ خان صاحب مرحوم فوج میں بھی بڑی آن بان سے رہے اور سچائی اور فرض

© NCERT not to be republished

شناسی میں مشہور تھے۔ یہ ڈرل اِنسٹرکٹر تھے یعنی گوروں کو جو نئے بھرتی ہوکر آتے تھے ڈرل سکھاتے تھے۔اس لیے اکثر گورے افسروں سے واقف تھے۔وہ بڑے شہسوار تھے۔گھوڑے کوخوب پہچانتے تھے۔ بڑے بڑے سرکش گھوڑے جو پٹھے پر ہاتھ نہ دھرنے دیتے تھے، انھوں نے درست کیے۔گھوڑے کے سدھانے اور پھیرنے میں اُنھیں کمال تھا۔چوں کہ بدن کے چھریرے اور ہلکے پھلکے تھے، گُھڑ دوڑوں میں گھوڑے دوڑاتے تھے اور اکثر شرطیں جیتتے تھے۔اُن کے افسر اُن کی مستعدی، خوش تدبیری اور سلیقے سے بہت خوش تھےلیکن کھرے پن سے وہ اکثراوقات ناراض ہوجاتے تھے۔ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ان کے کمانڈنگ افسر نے کسی بات پر خفا ہوکر جیسا کہ انگریزوں کا عام قاعدہ ہے انھیں 'ڈیم' کہہ دیا۔یہ تو گالی تھی، خاں صاحب کسی کی ترچھی نظر کے بھی روادار نہ تھے۔انھوں نے فوراًرپورٹ کردی۔لوگوں نے چاہا کہ معاملہ رفع دفع ہوجائے اور آگے نہ بڑھے،مگرخاں صاحب نے ایک نہ سُنی۔ معاملے نے طول کھینچا اور جنرل صاحب کولکھا گیا۔کمانڈنگ افسر کا کورٹ مارشل ہوا اور اُس سے کہا گیا کہ خان صاحب سے معافی مانگے۔ ہر چند اُس نے بچنا چاہا مگرپیش نہ گئی اور مجبوراً اُسے معافی مانگنی پڑی۔ایسی خودداری اور نازک مزاجی پر ترقی کی توقع رکھنا عبث ہے۔نتیجہ یہ ہوا کہ دفعداری سے آگے نہ بڑھے۔

اچھے بُرے ہرقوم میں ہوتے ہیں۔شریف افسرخاں صاحب کی سچائی، دیانت اور جفاکشی کی بہت قدر کرتے تھے اور اُن کو اپنی اردلی میں رکھتے تھے۔مگربعض ایسے بھی تھے جن کے سر میں خنّاس سمایا ہوا تھا، انھیں خاں صاحب کے یہ ڈھنگ پسند نہ تھے اور وہ ہمیشہ ان کے نقصان کے درپے رہتے تھے۔ایسے لوگ اپنی اور اپنی قوم والوں کی خوداری کوتو جوہرِشرافت سمجھتے ہیں لیکن اگر یہی جوہر کسی دیسی میں ہوتا ہے تو اُسے غرور اور گستاخی پر محمول کرتے ہیں۔تاہم اُن کے بعض انگریزی افسر اُن پر بہت مہربان تھے۔خاص کر کرنل فرن ٹین اُن پر بڑی عنایت کرتے تھے اور خاں صاحب پر اس قدر اعتبار تھا کہ شاید کسی اور پر ہو۔ جب کرنل صاحب نے اپنی خدمت سے استعفا دیا تو اپنا تمام مال و اسباب اور سامان جو ہزارہا روپے کا تھا، خاں صاحب کے سپرد کر گئے۔ یہ امرانگریز افسروں کو بہت ناگوار ہوا۔اس وقت کے کمانڈنگ افسر سے نہ رہا گیا اور اس نے کرنل موصوف کو خط لکھا کہ آپ نے ہم پر اعتماد نہ کیا اور ایک دیسی دفعدار کو اپنا تمام قیمتی سامان حوالے کرگئے۔اگر آپ یہ سامان ہمارے سپرد کرجاتے تو اسے اچھے داموں میں فروخت کرکے قیمت آپ کے پاس بھیج دیتے۔اب بھی اگر آپ لکھیں تو اس کا انتظام ہوسکتا ہے۔کرنل نے جواب دیا کہ مجھے نورخاں پرتمام انگریز افسروں سے زیادہ اعتماد ہے، آپ کوزحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔اس پر یہ لوگ اور برہم ہوئے۔

ایک بار کمانڈنگ افسر یہ سامان دیکھنے آیا اور کہنے لگا کہ فلاں فلاں چیز میم صاحب نے ہمارے ہاں سے منگائی تھی، چلتے

© NCERT not to be republished

وقت واپس کرنی بھول گئے، اب تم یہ سب چیزیں ہمارے بنگلے پر بھیج دو۔ خاں صاحب نے کہا میں ایک چیز بھی نہیں دوں گا، آپ کرنل صاحب کو لکھیے وہ اگر مجھے لکھیں گے تو مجھے دینے میں کچھ عذر نہ ہوگا۔ وہ اس جواب پر بہت بگڑا اور کہنے لگا تم ہمیں جھوٹا سمجھتے ہو؟ خاں صاحب نے کہا میں آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتا، یہ سامان میرے پاس امانت ہے اور میں کسی کو اس میں سے ایک تنکا بھی دینے کا مجاز نہیں۔ غرض وہ بڑبڑاتا ہوا کھسیانا ہوکر چلا گیا۔ خاں صاحب نے ایک انگریزی محرّر سے اس سامان کی مکمل فہرست تیار کرائی اور کچھ تو خود خرید کر کچھ نیلام کے ذریعے بیچ کر ساری رقم کرنل صاحب کو بھیج دی۔

نہ معلوم یہی کرنل تھا یا کوئی دوسرا افسر، جب ملازمت سے قطع تعلق کر کے جانے لگا تو اس نے ایک سونے کی گھڑی، ایک عمدہ بندوق اور پانسو روپے نقد خاں صاحب کو بطور انعام یا شکرانے کے دیے۔ خاں صاحب نے لینے سے انکار کیا، کرنل اور اس کی بیوی نے بہتیرا اصرار کیا مگر انھوں نے سوائے ایک بندوق کے دوسری چیز نہ لی اور باقی سب چیزیں واپس کر دیں۔

کرنل اسٹوارٹ بھی جو ہنگولی چھاؤنی کے افسر، کمانڈنگ افسر تھے، اُن پر بہت مہربان تھے۔ رسالے کے شریف انگریز ان سے کہا کرتے تھے کہ ہمارے بعد انگریز افسر تم کو بہت نقصان پہنچائیں گے۔ وہ ان کی روش سے خوش نہ تھے اور خوش کیوں کر ہوتے، خوشامد سے انھیں چڑتھی اور غلامانہ اطاعت آتی نہیں تھی۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ اپنے کرنل کے ہاں کھڑے تھے کہ ایک انگریز افسر گھوڑے پر سوار آیا، گھوڑے سے اُتر کر اس نے خاں صاحب سے کہا کہ گھوڑا پکڑو۔ انھوں نے کہا، ''میں سائیس نہیں ہوں۔'' اس نے ایسا جواب کاہے کو سنا تھا، بہت چیں بہ جبیں ہوا مگر کیا کرتا، آخر باگ درخت کی ایک شاخ سے اٹکا کر اندر چلا گیا۔ اب نہ معلوم یہ خاں صاحب کی شرارت تھی یا اتفاق تھا کہ باگ شاخ میں سے نکل گئی اور گھوڑا بھاگ نکلا۔ اب جو صاحب باہر آئے تو گھوڑا ندارد۔ بہت جھنجھلایا، بڑی مشکل سے تلاش کر کے پکڑوایا تو جگہ جگہ سے زخمی پایا۔ اس نے کرنل صاحب سے خاں صاحب کی بہت شکایت کی۔ معلوم نہیں کرنل نے اس انگریز کو کیا جواب دیا لیکن وہ خاں صاحب سے بہت خوش ہوا اور کہا کہ تم نے خوب کیا۔

خاں صاحب نے جب یہ رنگ دیکھا تو خیر اسی میں دیکھی کہ کسی طرح وظیفہ لے کر الگ ہو جائیں۔ وہ بیمار بن گئے اور ہسپتال میں رجوع ہوئے۔ کرنل اسٹوارٹ نے ڈاکٹر سے کہہ کر ان کو مدد دی اور اس طرح وہ کچھ دنوں بعد ڈاکٹر کی رپورٹ پر وظیفہ لے کر فوجی ملازمت سے سبک دوش ہو گئے۔ سچ ہے انسان کی برائیاں ہی اس کی تباہی کا باعث نہیں ہوتیں بعض وقت اس کی خوبیاں بھی اسے لے ڈوبتی ہیں۔

کرنل اسٹوارٹ نے بہت چاہا کہ وہ مسٹر ہنکن ناظم پولیس سے سفارش کر کے انھیں ایک اچھا عہدہ دلا دیں مگر خاں

© NCERT not to be republished

صاحب نے اسے قبول نہ کیا اور کہا کہ میں اب اپنے وطن دولت آباد ہی میں رہنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ صوبے دار صاحب اورنگ آباد سے سفارش فرمادیں تو بہت اچھا ہو۔ کرنل صاحب بہت اصرار کرتے رہے کہ دیکھو تمھیں پولیس میں بہت اچھی خدمت مل جائے گی انکار نہ کرو مگر یہ نہ مانے۔ آخر مجبور ہو کر نواب مقتدر جنگ بہادر صوبے دار صوبہ اورنگ آباد سے سفارش کی۔ صوبے دار صاحب کی عنایت سے وہ قلعۂ دولت آباد کی جمعیت کے جمعدار ہوگئے اور بہت خوش تھے۔

نواب مقتدر جنگ کے بعد نواب بشیر نواز جنگ اورنگ آباد کی صوبے داری پر آئے۔ وہ بھی خاں صاحب پر بہت مہربان تھے۔ اسی زمانے میں لارڈ کرزن وائسرائے دولت آباد تشریف لائے۔ خاں صاحب نے سلامی دینے کی تیاری کی۔ کئی توپیں ساتھ ساتھ رکھ کر سلامی دینی شروع کی۔ لارڈ کرزن گھڑی نکال کر دیکھ رہے تھے۔ جب سلامی ختم ہوئی تو نواب صاحب سے خاں صاحب کی تعریف کی۔ سلامی ایسے قاعدے اور اندازے سے دی کہ ایک سکنڈ کا فرق نہ ہونے پایا۔ نواب صاحب نے اس کا تذکرہ خاں صاحب سے کیا اور کہا کہ میاں اب تمھاری خیر نہیں معلوم ہوتی۔

لارڈ کرزن جب قلعہ کے اوپر بالا حصار پر گئے تو وہاں ستانے کے لیے کرسی پر بیٹھ گئے اور جیب سے سگرٹ دان نکال کر سگرٹ پینا چاہا۔ دِیا سلائی نکال کر سگرٹ سلگایا ہی تھا کہ یہ فوجی سلام کرکے آگے بڑھا اور کہا کہ یہاں سگرٹ پینے کی اجازت نہیں ہے۔ لارڈ کرزن نے جلتا ہوا سگرٹ نیچے پھینک دیا اور جوتے سے رگڑ ڈالا۔ یہ حرکت دیکھ کر نواب بشیر نواز جنگ بہادر اور دوسرے عہدے داروں کا رنگ فق ہوگیا۔ مگر موقع ایسا تھا کہ کچھ کہہ نہیں سکتے تھے، لہو کے سے گھونٹ پی کر چپ رہ گئے۔ بعد میں بہت کچھ لے دے کی مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ خاں صاحب نے قاعدے کی پوری پابندی کی تھی، اس میں چوں وچرا کی گنجائش نہ تھی۔

اب اسے اتفاق کہیے یا خاں صاحب کی تقدیر کہ لارڈ کرزن نے جانے کے بعد ہی فنانس کی معتمدی کے لیے مسٹر واکر کا انتخاب کیا۔ ریاست کے مالیے کی حالت اس زمانے میں بہت خراب تھی۔ مسٹر واکر نے اصلاحیں شروع کیں۔ اس لپیٹ میں قلعۂ دولت آباد بھی آگیا، اوروں کے ساتھ خاں صاحب بھی تخفیف میں آگئے۔

دولت آباد میں ان کی کچھ زمین تھی، اس میں باغ لگانا شروع کردیا۔ مسٹر واکر دورے پر دولت آباد آئے تو ایک روز ٹہلتے ٹہلتے ان کے باغ میں بھی آپہنچے۔ خاں صاحب بیٹھے گھاس کھرپ رہے تھے۔ مسٹر واکر کو آتے دیکھا تو اُٹھ کر سلام کیا۔ پوچھا کیا حال ہے، کہنے لگے آپ کی جان ومال کو دُعا دیتا ہوں۔ اب آپ کی بدولت گھاس کھودنے کی نوبت آگئی۔ مسٹر واکر نے کہا یہ اچھا کام ہے۔ دیکھو تمھارے درخت انجیروں سے کیسے لدے ہوئے ہیں۔ ایک ایک آنے کو بھی ایک ایک انجیر بیچو تو کتنی آمدنی ہوجائے

© NCERT not to be republished

گی۔خاں صاحب گھبرائے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کم بخت انجیروں پر بھی ٹیکس لگا دے۔تڑ سے جواب دیا کہ آپ نے انجیر لدے ہوئے تو دیکھ لیے اور یہ نہ دیکھا کہ کتنے سڑگل کر گر جاتے ہیں۔کتنے آندھی ہوا سے گر پڑتے ہیں، کتنے پرند کھا جاتے ہیں اور پھر ہماری دِن رات کی محنت۔مسٹر واکر مسکراتے ہوئے چلے گئے۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر سید سراج الحسن صاحب اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات ہو کر آئے تھے۔ڈاکٹر صاحب بلا کے مردم شناس ہیں۔تھوڑی ہی دیر میں اور چند ہی باتوں میں آدمی کو ایسا پرکھ لیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ پھر جیسا وہ آدمی کو سمجھتے ہیں ویسا ہی نکلتا ہے۔کبھی خطا ہوتے نہیں دیکھی۔ڈاکٹر صاحب ایسے قابل جوہروں کی تلاش میں رہتے ہیں،فوراً ہی اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ڈاکٹر صاحب کا برتاؤ ان سے بہت شریفانہ اور دوستانہ تھا۔نواب برزور جنگ اس زمانے میں صوبے دار تھے۔مقبرے کا باغ ان کی نگرانی میں تھا۔ڈاکٹر صاحب نے سفارش کرکے باغ سے پانچ روپے ماہانہ الونس (الاؤنس) مقرّر کرا دیا۔

نواب برزور جنگ کے پاس ایک گھوڑا تھا، وہ اسے بیچنا چاہتے تھے۔کلب میں کہیں اس کا ذکر آیا۔ڈاکٹر صاحب نے کہا مجھے گھوڑے کی ضرورت ہے۔میں اُسے خرید لوں گا مگر پہلے نور خاں کو دکھا لوں۔وہاں سے آکر ڈاکٹر صاحب نے خاں صاحب سے یہ واقعہ بیان کیا اور کہا کہ بھئی اُس گھوڑے کو دیکھ آؤ کوئی عیب تو نہیں۔خاں صاحب نے کہا آپ نے غضب کیا میرا نام لے دیا۔گھوڑے میں کوئی عیب ہوا تو میں چھپاؤں گا نہیں اور صوبے دار صاحب مفت میں مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔ڈاکٹر صاحب نے کہا تم خواہ مخواہ وہم کرتے ہو،کل جاکے ضرور گھوڑا دیکھ لو۔خاں صاحب گئے۔گھوڑا نسل کا تو اچھا تھا مگر پانچوں شرعی عیب موجود تھے۔انھوں نے صاف صاف آکے کہہ دیا اور ڈاکٹر صاحب نے خریدنے سے اِنکار کر دیا۔صوبے دار صاحب آگ بگولا ہو گئے۔دوسرے روز مقبرے میں آئے۔ باغ کا رجسٹر منگایا اور نور خاں کے نام پر اس زور سے قلم کھینچا کہ اگر لفظوں میں جان ہوتی تو وہ بلبلا اُٹھتے۔ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا تو بہت افسوس کیا مگر انھوں نے اس کی تلافی کر دی۔ یہ سن کر صوبے دار صاحب اور بھی جھنجھلائے۔

ڈاکٹر صاحب ترقی پا کر حیدرآباد چلے گئے۔اُن کی خدمت کا دوسرا انتظام ہو گیا۔کچھ دنوں بعد ڈاکٹر صاحب ناظم تعلیمات ہو گئے اور میں ان کی عنایت سے صدر مہتمم تعلیمات ہو کر اورنگ آباد آیا۔ڈاکٹر صاحب ہی نے مجھے نور خاں سے ملایا اور ان کی سفارش کی۔ڈاکٹر صاحب نے انھیں عارضی طور پر دولت آباد میں مدرّس کر دیا تھا، میں نے عارضی طور پر اپنے دفتر میں محرّر کر دیا، وہ مدرّسی اور محرّری تو کیا کرتے مگر بہت سے مدرّسوں اور محرّروں سے زیادہ کارآمد تھے۔ڈاکٹر صاحب نے جب باغ کی نگرانی میرے حوالے کی تو خاں صاحب کا الونس بھی جاری ہو گیا۔

© NCERT not to be republished

اعلاحضرت واقدس بعد تخت نشینی اورنگ آباد رونق افروز ہوئے تو یہاں کی خوش آب وہوا کو بہت پسند فرمایا اور عظیم الشان باغ لگانے کا حکم دیا۔ یہ کام ڈاکٹر صاحب کے سپرد ہوا اور ان سے بہتر کوئی یہ کام کر بھی نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی مہربانی سے آخر اس باغ کے عملے میں خاں صاحب کو بھی ایک اچھی سی جگہ مل گئی جو اُن کی طبیعت کے مناسب تھی اور آخر دم تک وہ اسی خدمت پر رہے۔ اور جب تک دم میں دم رہا، اپنے کام کو بڑی محنت اور دیانت سے کرتے رہے۔

یوں محنت سے کام تو اور بھی کرتے ہیں لیکن خاں صاحب میں بعض ایسی خوبیاں تھیں جو بڑے بڑے لوگوں میں بھی نہیں ہوتیں۔ سچائی بات کی اور معاملے کی اُن کی سرشت میں تھی۔ خواہ جان ہی پر کیوں نہ بن جائے وہ سچ کہنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔ اس میں انھیں نقصان بھی اُٹھانے پڑے مگر وہ سچائی کی خاطر سب کچھ گوارا کر لیتے تھے۔ مستعد ایسے تھے کہ اچھے اچھے جوان اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ دن ہو، رات ہو، ہر وقت کام کرنے کے لیے تیار۔ اکثر دولت آباد سے پیدل آتے جاتے تھے۔ کسی کام کو کہیے تو ایسی خوشی خوشی کرتے تھے کہ کوئی اپنا کام بھی اس قدر خوشی سے نہ کرتا ہوگا۔ دوستی کے بڑے پکّے اور بڑے وضع دار تھے۔ چونکہ ادنا اعلا سب اُن کی عزّت کرتے تھے اس لیے اُن سے غریب دوستوں کے بہت سے کام نکلتے تھے۔ اُن کا گھر مہمان سرائے تھا۔ اورنگ آباد کے آنے جانے والے کھانے کے وقت بے تکلف اُن کے گھر پہنچ جاتے اور وہ اس سے بہت خوش ہوتے تھے۔ بعض لوگ جو مسافر بنگلے میں آکر ٹھہر جاتے تھے ان کی بھی دعوت کر دیتے تھے۔ بعض اوقات ٹولیوں کی ٹولیاں پہنچ جاتی تھیں اور وہ ان کی دعوتیں بڑی فیاضی سے کرتے تھے۔ اس قدر قلیل معاش ہونے پر ان کی یہ مہمان نوازی دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اُن کی بیوی بھی ایسی نیک بخت تھی کہ دفعتاً مہمانوں کے پہنچ جانے سے کبیدہ خاطر نہ ہوتی تھی بلکہ خوشی خوشی کام کرتی اور کھلاتی تھی۔ خود دار ایسے تھے کہ کسی سے ایک پیسے کا روادار نہ ہوتے تھے۔ ڈاکٹر سراج الحسن ہر چند طرح طرح سے اُن کے ساتھ سلوک کرنا چاہتے تھے مگر وہ ٹال جاتے تھے۔ مجھ سے انھیں خاص اُنس تھا۔ میں کوئی چیز دیتا تو کبھی انکار نہ کرتے بلکہ کبھی کبھی خود فرمائش کرتے تھے۔ مٹھاس کے بے حد شائق تھے۔ اُن کا قول تھا کہ اگر کسی کو کھانے کو میٹھا ملے تو نمکین کیوں کھائے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ''نمکین کھانا مجبوری سے کھاتا ہوں، مجھ میں اگر استطاعت ہو تو ہمیشہ مٹھاس ہی کھایا کروں اور نمکین کو ہاتھ نہ لگاؤں۔'' انھیں مٹھاس کھاتے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اکثر جیب میں گُڑ رکھتے تھے۔ ایک بار میرے ساتھ دعوت میں گئے، قسم قسم کے تکلّف کے کھانے تھے۔ خاں صاحب نے چھوٹتے ہی میٹھے پر ہاتھ ڈالا۔ ایک صاحب جو دعوت میں شریک تھے یہ خیال کر کے کہ خاں صاحب کو دھوکا ہوا ہے کہنے لگے کہ ''حضرت یہ میٹھا ہے۔'' مگر انھوں نے کچھ پروا نہ کی اور برابر کھاتے رہے۔ جب وہ ختم ہوگیا تو دوسرے میٹھے پر ہاتھ بڑھایا۔ ان صاحب نے پھر ٹوکا کہ حضرت یہ میٹھا ہے، انھوں نے کچھ جواب نہ دیا اور اسے بھی ختم کر ڈالا۔ جب کبھی وہ کسی

© NCERT not to be republished

دوست کے ہاں جاتے تو وہ اُنھیں ضرور میٹھا کھلاتے اور یہ خوش ہو کر کھاتے۔

خاں صاحب بہت زندہ دل تھے، چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی جسے دیکھ کر خوشی ہوتی تھی۔ وہ بچوں میں بچے، جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بوڑھے تھے۔ غم اور فکر کو پاس نہ آنے دیتے تھے اور ہمیشہ خوش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی خوش رکھتے تھے۔ ان سے ملنے اور باتیں کرنے سے غم غلط ہوتا تھا۔ آخر دم تک ان کی زندہ دلی ویسی ہی رہی۔

ڈاکٹر سراج الحسن صاحب جب کبھی اورنگ آباد آتے تو اسٹیشن سے اُترتے ہی اپنا روپیہ پیسہ سب اُن کے حوالے کر دیتے اور سب خرچ انھیں کے ہاتھ سے ہوتا تھا۔ جانے سے پہلے ایک روز قبل وہ حساب لے کے بیٹھتے، بعض وقت جب بِدہ نہ ملتی تو آدھی آدھی رات تک لیے بیٹھے رہتے تھے۔ ہر چند ڈاکٹر صاحب کہتے کہ خاں صاحب یہ تم کیا کرتے ہو، جو خرچ ہوا ہوا، باقی جو بچا وہ دے دیا یا زیادہ خرچ ہوا ہو تو لے لیا۔ مگر وہ کہاں مانتے تھے، جب تک حساب ٹھیک نہ بیٹھتا انھیں اطمینان نہ ہوتا۔ چلتے وقت کہتے کہ لیجیے صاحب یہ آپ کا حساب ہے، اتنا خرچ ہوا اور اتنا بچا۔ یا کچھ زیادہ خرچ ہو جاتا تو کہتے کہ اتنے پیسے ہمارے خرچ ہوئے ہیں یہ ہمیں دلوائیے۔ کبھی ایسا ہوا کہ انھیں کچھ شبہ ہوا تو جانے کے بعد پھر حساب لے کے بیٹھتے اور خط لکھ کر بھیجتے کہ اتنے آنے آپ کے رہ گئے تھے وہ بھیجے جاتے ہیں یا اتنے پیسے میرے زیادہ خرچ ہو گئے تھے وہ بھیج دیجیے گا۔ ڈاکٹر صاحب ان باتوں پر بہت جھنجھلاتے تھے مگر وہ اپنی وضع نہ چھوڑتے تھے۔

وہ حساب کے کھرے، بات کے کھرے اور دل کے کھرے تھے۔ وہ مہر و وفا کے پتلے اور زندہ دلی کی تصویر تھے۔ ایسے نیک نفس، ہم درد، مرنج و مرنجان اور وضع دار لوگ کہاں ہوتے ہیں۔ اُن کے بڑھاپے پر جوانوں کو رشک آتا تھا اور ان کی مستعدی کو دیکھ کر دل میں اُمنگ پیدا ہوتی تھی۔ ان کی زندگی بے لوث تھی اور اُن کی زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا۔ مجھے وہ اکثر یاد آتے ہیں اور یہی حال ان کے دوسرے جاننے والوں اور دوستوں کا ہے۔ اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ کیسا اچھا آدمی تھا۔ قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے نور خاں ہوتے!

____ مولوی عبدالحق

© NCERT not to be republished

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ مصنف نے نورخاں کو گدڑی کا لال کیوں کہا ہے؟
2۔ نورخاں نے کمانڈرنگ آفیسر کی رپورٹ کیوں کی اور اس کا کیا اثر ہوا؟
3۔ نورخاں کی فرض شناسی کے کسی ایک واقعے کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔
4۔ ’’قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں،‘‘ اس جملے کی وضاحت کیجیے۔

© NCERT not to be republished

اشرف صبوحی

(1905 – 1990)

سید ولی اشرف نام اور صبوحی تخلص، ادبی دنیا میں اشرف صبوحی کے نام سے مشہور ہوئے۔ 11 مئی 1905 کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ 1922 میں اینگلو عربک ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد ادیب کامل، منشی فاضل، ایف اے اور بی اے کے امتحانات پرائیوٹ طور پر پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پاس کر کے 1929 میں محکمۂ ڈاک اور تار میں ملازم ہوئے۔

ابتدا میں بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں۔ دہلی سے شائع ہونے والے ادبی رسالوں میں کئی مضامین شائع ہوئے۔ ایک ادبی ماہنامہ ''ارمغان'' بھی جاری کیا جو دو سال تک شائع ہوتا رہا۔ 1947 میں تقسیم ملک کے بعد لاہور (پاکستان) چلے گئے۔ ان کا انتقال کراچی میں ہوا۔

اشرف صبوحی نے دہلی کے روزمرہ بامحاورہ ٹکسالی زبان میں ادبی مضامین اور افسانے لکھے اور تراجم بھی کیے۔ ''دلی کی چند عجیب ہستیاں'' اور ''غبارِ کارواں'' ان کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔ ''جھروکے'' افسانوں اور خاکوں کا مجموعہ ہے۔ ''سلمٰی'' (بغداد کا جوہری)، ''بن باسی دیوی''، ''دھوپ چھاؤں''، ''ننگی دھرتی'' اور ''موصل کے سوداگر'' انگریزی کے تراجم ہیں۔ ان کے علاوہ بیس سے زائد بچوں کی کہانیوں پر مشتمل کتابیں ہیں۔

© NCERT not to be republished

مرزا چپاتی

5019CH11

خُدا بخشے مرزا چپاتی کو، نام لیتے ہی صورت آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ گورا رنگ، بڑی بڑی اُبلی ہوئی آنکھیں، لمبا قد شانوں پر سے ذرا جُھکا ہوا، چوڑا اشفّاف ماتھا، تیموری ڈاڑھی، چنگیزی ناک، مغلئی ہاڑ۔ لڑکپن تو قلعے کی در و دیوار نے دیکھا ہوگا۔ جوانی دیکھنے والے بھی ٹھنڈا سانس لینے کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ڈھلتا وقت اور بڑھاپا ہمارے سامنے گزرا ہے۔ لُٹے ہوئے عیش کی ایک تصویر تھے۔ رنگ روغن اُترا ہوا محمد شاہی کھلونا تھا جس کی کوئی قیمت نہ رہی تھی۔

کہتے ہیں کہ دِلّی کے آخری تاج دار ظفر کے بھانجے تھے۔ ضرور ہوں گے۔ پوتڑوں کی شاہ زادگی ٹھیکروں میں دم توڑ رہی تھی، لیکن مزاج میں رنگیلا پن وہی تھا۔ جلی ہوئی رسّی کے سارے بل گِن لو۔ جب تک جیے پرانی وضع کو لیے ہوئے جیے۔ مرتے مرتے نہ کبوتر بازی چھوٹی، نہ پتنگ بازی۔ مُرغے لڑائے یا بُلبل، تیراکی کا شغل رہا یا شعبدے بازی کا۔ شطرنج کے بڑے ماہر تھے۔ غائب کھیلتے تھے۔ خدا جانے غدر میں یہ کیوں کر بچ گئے اور جیل کے سامنے والے خونی دروازے نے اِن کے سر کی بھینٹ کیوں نہ قبول کی؟ انگریزی عمل داری ہوئی۔ بدامنی کا کوئی اندیشہ نہ رہا تو مراحم خسروانہ کی لہر اُٹھی۔ خاندانِ شاہی کی پرورش کا خیال آیا پینشنیں مقرر ہوئیں۔ مگر برائے نام۔

لیکن صاحبِ عالم مرزا فخرالدین عرف مرزا فخرو الملقّب بہ مرزا چپاتی نے مردانہ وار زندگی گزاری۔ گھر بار جب کبھی ہوگا، ہوگا۔ ہماری جب سے یاد اللہ ہوئی دم نقد ہی دیکھا۔ قلعے کی گود میں بازیوں کے سوا اور سیکھا ہی کیا تھا جو بگڑے وقت میں آبرو بناتا۔ اپنے والد رحیم الدین حیؔا سے ایک فقط شاعری ورثے میں ملی تھی، پڑھنا لکھنا آتا نہ تھا۔ پھر زبان توتلی مگر حافظہ اس بلا کا تھا کہ سو سو بند کے مسدّس ازبر تھے۔ کیا مجال کہ کہیں سے کوئی مصرع بھول جائیں۔ گویا گراموفون تھے، کوک دیا اور چلے۔

ایک دن کسی شخص نے مرزا صاحب کے سامنے یہ مصرع پڑھا

سر عدو کا ہو نہیں سکتا میرے سر کا جواب

اور اس پر مصرع لگانے کی فرمائش کی۔ مرزا صاحب نے اسی وقت بہترین مصرع لگا کر اس طرح ایک اعلا پایہ کا شعر بنا دیا۔

شہ نے عابد سے کہا بدلہ نہ لینا شمر سے
سر عدو کا ہو نہیں سکتا میرے سر کا جواب

© NCERT not to be republished

قلعہ مرحوم کے حالات اورموجودہ تہذیب پر اُن کی نوک جھونک جتنی مزہ دیتی تھی، وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔کبھی کبھی وہ مجھے پتنگ بازی کے دنگلوں میں لے جاتے تھے۔ مُرغ اور بُلبلوں کی پالیاں بھی دکھائیں۔ تیراکی کے میلوں میں بھی لے گئے۔ کبوتر بھی مجھے دکھا دکھا کر اُڑائے۔سب کچھ کیا، میں جہاں تھا وہیں رہا۔ ہر جگہ اُن کا دماغ کھایا۔انھیں بھی میری خاطر ایسی منظور تھی کہ بادلِ خواستہ یا ناخواستہ وہ سب کچھ مجھے بتاتے۔

ایک دن دوپہر کے کوئی دو بجے ہوں گے۔ برسات کا موسم تھا۔کئی گھنٹے کی موسلا دھار بارش کے بعد ذرا بادل چھٹے تھے کہ حضرت معمول کے خلاف میرے پاس تشریف لائے۔ مُنہ بنا ہوا، آنکھیں اُبلی ہوئی۔ چہرے سے غصّہ ٹپک رہا تھا۔ میں نے کہا خدا خیر کرے۔آج تو صاحبِ عالم کے تیور کچھ اور ہیں۔کئی منٹ تک خاموش بیٹھے رہے اور میں ان کا مُنہ تکتا رہا۔ ذرا سانس درست ہوا تو بولے ’’سید! اس پٹھانچے کا بڑ مغزاپن بھی دیکھا۔ بڑا افلاطون بنا پھرتا ہے۔ باوا تو جھک جھک کر مجرا کرتے کرتے مر گیا، یہ بابو بن کر بابو کی طرح دُلتیاں جھاڑتا ہے۔ہے شرط کہ چار جامہ کس دوں، ساری ٹرفش نکل جائے گی۔‘‘

میں : میں بالکل نہیں سمجھا۔ہوا کیا؟ کون پٹھانچہ؟

مرزا : ایسے ننّھے سمجھے ہی نہیں۔میاں! وہی کالے خاں کا لڑکا جو کچہری میں نوکر ہے۔

میں : منیر۔کیا اس نے کچھ گستاخی کی؟

مرزا : گستاخی! نہ ہوا ہمارا زمانہ، خاندان بھر کو کولھو میں پسوا دیتا۔

میں : بڑا نالائق ہے۔کیا بات ہوئی؟

مرزا : ہوا یہ کہ میں کبوتروں کا دانہ لینے نکلا۔گلی کے نکڑ پر بنیے کی دُکان ہے۔ نالیوں میں دھائیں دھائیں پانی بہہ رہا تھا۔ساری گلی میں کیچڑ ہی کیچڑ تھی۔ محلّے والوں نے جابجا پتّھر رکھ دیے تھے کہ آنے جانے والے اِن پر پاؤں (پاؤں) رکھ کر گزر جائیں۔ دیکھتا کیا ہوں وہ اکڑے خاں بیچ گلی میں کھڑے ہوئے ایک خوانچے والے سے جھک جھک کر رہے ہیں۔گلی تنگ، کیچڑ اور پانی۔پتھّروں پر ان کا قبضہ۔کوئی بھلا اس پر گزرے تو کہاں سے؟ میں نے کہا کہ میاں راستہ چھوڑ کر کھڑے ہو۔ یہ کون سی انسانیت ہے کہ سارا راستہ روک رکھا ہے۔تڑا کر جواب دیا کہ چلے جاؤ۔ مجھے تاؤ آ گیا۔ بولا کہ تمھارے سر پر سے جاؤں۔بس پھر کیا تھا جامے سے باہر نکل پڑا۔ وہ تو پاس پڑوس کے دو چار آدمی نکل آئے اور بیچ بچاؤ کرا دیا ورنہ آج یا وہ نہیں تھا یا میں۔ خیر جاتا کہاں ہے۔آج کے ٹھپے آج ہی نہیں جلا کرتے۔

میں : صاحبِ عالم! آپ اپنی طرف دیکھیے۔ جو ظرف میں ہوتا ہے وہی چھلکتا ہے۔آنے دیجیے وہ ڈانٹ بتاؤں کہ ہاتھ جوڑتے

© NCERT not to be republished

بنے.........................سُنا ہے کہ قلعے کے آخری دور ہی میں شہر کی حالت بدل گئی تھی۔ نہ چھوٹوں کا رکھ رکھاؤ رہا تھا نہ بڑوں کا ادب۔

مرزا : توبہ توبہ تم نے تو دلّی کو دم توڑتے بھی نہیں دیکھا۔ اس کا مردہ دیکھا ہے۔ مُردہ، وہ بھی لاوارث! میاں شہر آبادی کی باتیں قلعے والوں کے صدقے میں تھیں۔ جیسے جیسے وہ اُٹھتے گئے دلّی میں اصلیت کا اندھیرا ہوتا گیا۔ اب تو نئی روشنی ہے نئی باتیں۔ اور تو خدا بخشے دلّی کی صفتیں تم کیا جانو۔ پڑھے لکھے ہو۔ شاعری کا بھی شوق ہے۔ بھلا بتاؤ تو سہی اُردو کی کتنی قسمیں ہیں؟ میں نے حیران ہوکر پوچھا ''صاحبِ عالم اُردو کی قسمیں کیسی؟ یہ بھی ایک کہی۔ مجھ پر بھی داؤ کرنے لگے۔'' ''واہ بھئی معلوم ہوا کہ تم دلّی والے نہیں۔ کہیں باہر سے آکر بس گئے ہو۔'' میں شرمندہ تھا کہ کیا جواب دوں۔ میرے نزدیک تو صرف ایک ہی قسم کی اُردو تھی۔ زیادہ سے زیادہ عوام دخواص کا فرق سمجھ لو۔ مگر یہ قسمیں کیا معنی؟ مجھے چُپ دیکھ کر مرزا مُسکرائے اور کہنے لگے ''سیّد پریشان نہ ہو۔ مجھ سے سُن اور یاد رکھ۔ بھولیو نہیں پھر پوچھے گا تو نہیں بتاؤں گا۔'' میں بڑے شوق سے متوجّہ ہوا اور انھوں نے انگرکھے کے دامن سے مُنہ پونچھ کر کہنا شروع کیا۔ دیکھ اوّل نمبر پر تو اُردوئے معلّٰی ہے جس کو ماموں حضرت اور اُن کے پاس اُٹھنے بیٹھنے والے بولتے تھے۔ وہاں سے شہر میں آئی اور قدیم شرفا کے گھروں میں آ چھپی۔ دوسرا نمبر قل آعوذ اُردو کا ہے جو مولویوں، واعظوں اور عالموں کا گلا گھوٹتی رہتی ہے۔ تیسرے خودرنگی اُردو۔ یہ ماں ٹینی باپ کلنگ والوں نے رنگ برنگ کے بچّے نکالے ہیں۔ اخبار اور رسالوں میں اِسی قسم کی اُردو، ادب کا اچھوتا نمونہ کہلاتا ہے۔ چوتھے ہڑدنگی اُردو، مسخروں اور آج کل کے قومی بلّم ٹیروں کی مُنہ پھٹ زبان ہے۔ پانچویں لفنگی اُردو ہے جسے آکا بھائیوں کی لٹھ مار، کڑاکے دار بولی کہو یا پہلوانوں، کرخنداروں، ضلع جگت کے ماہروں، پھبتی بازوں اور گلیروں کا روزمرّہ۔ چھٹے نمبر پر فرنگی اُردو ہے جو تازہ ولایت انگیز۔ ہندستانیوں عیسائی ٹوپ لگائے ہوئے کرانی، دفتر کے بابو، چھاونیوں کے سوداگر وغیرہ بولتے ہیں۔ پھر ایک سربھنگی اُردو ہے یعنی چرسیوں، بھنگڑوں، بےنواؤں اور تکیے داروں کی زبان۔'' میں نے کہا آج تو بہرہ کھُلا ہوا ہے۔ بھئی خوب تقسیم ہے کیوں نہ ہو، آخر شاہ جہانی دیگ کی کھُرچن ہے۔ میری طرف دیکھ کر ایک گہرا ٹھنڈا سانس بھرا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے اور کہنے لگے ''سیّد! ابھی تم نے کیا دیکھا ہے اور کیا سُنا ہے۔ قلعہ آباد ہوتا، دربار دیکھے ہوتے تو اصلی زبان کا بناؤسنگار نظر آتا۔ اب تو ہماری زبان بیسنی ہوگئی ہے۔ وہ لچیلی چونچلے کی باتیں، شریفوں کے انداز، امیروں کی آن، سپاہیوں کی اکڑفوں، وہ خادمانہ اور خوردانہ آداب وانکسار، شاعروں کے لچھّے دار فقرے، شہروالوں کا میل جول، پرانے گھرانوں کے رسم ورواج، وہ مرّوت وہ آنکھ کا لحاظ کہاں؟ مجلسوں محفلوں کا رنگ

بدل گیا، میلے ٹھیلے، پرانے کرتب، اگلے ہنر سب مٹتے جاتے ہیں۔ اشراف گردی نے بھلے مانسوں کو گھر بیٹھا دیا۔ فیل نشین، پالکیوں میں بیٹھنے والے کھپریلوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ مفلسی، ناداری نے رذالوں کے آگے سر جھکوا دیے۔ موری کی اینٹ چوبارے چڑھ گئی۔ کم ظرفوں، ٹینیوں کے گھر میں دولت پھٹ پڑی۔ زمانہ جب کمینوں کی پشتی پر ہو تو خاندانیوں کی کون قدر کرتا؟ پیٹ کی مار نے صورتیں بگاڑ دیں، چال چلن میں فرق آ گیا۔ ہمّت کے ساتھ حمیّت بھی جاتی رہی۔

مرزا نے یہ تقریر کچھ ایسے عبرت خیز لفظوں میں کی کہ میرا دل بھر آیا اور میں نے گفتگو کا پہلو بدلنے کی کوشش کی۔

میں : کیوں حضّت، غدر سے پہلے دِلّی والوں کا لباس کیا تھا؟ دو چار پرانی وضع کے لوگ دیکھنے میں آئے ہیں۔ اُن کی برزخ تو کچھ عجیب ہی سی معلوم ہوتی تھی۔

مرزا : جھوٹے ہو تم نے کہاں دیکھا ہوگا۔ کوئی بہروپیا یا نقّال نظر آ گیا ہوگا۔ میاں اُن وقتوں میں ادنا اعلا میں یک رنگی نہ تھی............ درباری اور بازاری لوگ لباس سے پہچانے جاتے تھے۔ عام طور پر اپنی شکل و شباہت، تن و توش، جسامت اور پیشے کے مطابق کپڑا پہنا جاتا تھا کہ دُور سے دیکھ کر پہچان لیں کہ کس خاندان کا اور کیسا آدمی ہے؟ اگر نوجوان ہے تو ایک ایک ٹانکے پر جوانی برستی ہے۔ بوڑھا ہے تو پیری اور سادگی ٹپکتی ہے۔ بانکوں کا بانک پن، چھیلاؤں، ملاؤں کی ملاّئی، پہلوانوں کی پہلوانی، رذالوں کی رذالت اور شریفوں کی شرافت لباس سے صاف بھانپ لی جاتی تھی۔ چھوٹے آدمی جس پوشاک کو اختیار کر لیتے تھے، بھلے مانس چھوڑ دیتے تھے۔ دو پلڑی ٹوپیوں کا عام رواج تھا مگر چوگوشی، پچ گوشی، گول، مغلئی، تاج دار ٹوپیاں، مغل بچّے اور شریف زادے پہنتے تھے۔ قلعے کے آنے جانے والوں میں مندیلیں، بنارسی دوپٹّے، گولے دار پگڑیاں— مسلمانوں کا حصّہ تھا۔ درباری جامہ بھی پہنا کرتے تھے۔ اُمرا چغہ سرپیچ اور شہزادوں میں کلغیاں بھی مروّج تھیں۔ ہندوؤں میں پہلے جامے کا زیادہ دستور تھا، پھر نیم جامہ اور اُلٹی چولی کے انگرکھے پہننے لگے۔ علاوہ ازیں الخالق، اچکن، قبا، عبا، جبّہ، چغہ، مرزئ وغیرہ بھی استعمال ہوتے تھے۔ پاپجامے یا تو تنگ موری کے یا اِک برے یا غرارے دار ہوتے تھے۔ ڈاڑھی مونچھوں کی وضع بھی ہر خاندان اور ہر پیشہ ور کی علاحدہ تھی۔

میں : مگر یہاں والوں کو فضول کھیلوں، دولت کو لٹانے والی بازیوں اور بے کار مشغلوں کے سوا کام ہی نہ تھا۔

مرزا : تم کیا جانو کہ وہ بازیاں اور اُن کے مشغلے کیسے کمال کے تھے۔ ویسے ہُنر آج کوئی نہیں پیدا کر لیتا۔ زہرہ پھٹ جائے زہرہ۔ بات یہ ہے کہ ساری چیزیں وقت سے ہوتی ہیں۔ نامردوں کا زمانہ ہے تو نامردوں کی سی باتیں بھی ہیں۔ شریفوں کا شغل ڈنڑ، مگدر، بانک، بنّوٹ، پھکیتی، اِکنگ، تیراندازی، نیزہ بازی، پنجہ کشی تھا۔ کہہ دو بے کار تھا۔ تیراکی، کشتی، شکرے اور باز

© NCERT not to be republished

کا شکار، پتنگ لڑانا، کبوتر بازی وغیرہ سے دل چسپی تھی۔ کہہ دو یہ بھی فضولیات ہیں۔

میں : فضولیات نہیں تو اور کیا ہیں؟

مرزا : جی ہاں فضولیات ہیں۔ خُدا کے بندے ان ہی باتوں سے تو دلّی دلّی تھی۔ ورنہ شاہجہاں کی بسائی ہوئی محمد شاہی دِلّی اور خورجہ بلند شہر میں کیا فرق۔ پھکیت اور بنوٹیے ایسے ہوتے تھے کہ موقع پڑتا تو رومال میں صرف پیسا یا ٹھیکری باندھ کر حریف کے سامنے آ جاتے اور دو جھکائیوں میں ہتھیار چھین لیتے۔ تیراکی کا یہ حال تھا کہ پالتی مارے ہوئے پانی پر بیٹھے ہیں جیسے مسند پر...... دُھواں اُڑاتے اور ملہار سنتے چلے جاتے ہیں۔ قلعے کی حمام والی نہر تو دیکھی ہوگی۔ گز سوا گز کا پاٹ ہے اور بالشت بھر سے زیادہ گہرائی نہیں۔ اس میں آج کوئی مائی کا لال تیر کر دکھائے تو میں جانوں۔ میر مچھلی تو خیر اُستاد تھے، ان کا سا کمال تو کسے میسّر ہے۔ دو چار گز تو اتنے پانی میں تیر کر میں بھی دکھا سکتا ہوں۔

میں : اجی جناب آپ ریت پر تیریے، حبابوں پر کھڑی لگائیے، نتیجہ؟ کھیل ہی تو تھے۔ پھر یہ کبوتر بازی، پتنگ بازی، مُرغ بازی، مینڈھے بازی کیا بلا تھی؟ بچارے بے زبانوں کو لہولہان کرنا اور اپنا دل بہلانا کیا اچھے ہنر تھے۔

مرزا : ارے میاں ایرانی تورانی منچلے، دہم ہو کر کیا چوڑیاں پہن لیتے۔ جنگ و جدال کا خیال انسانی قربانیوں، ملک ستانیوں کے چاؤ، خون کی پچکاریوں سے ہولی کا وقت تو لد گیا تھا۔ نہ ان پر کوئی چڑھ کر آتا تھا نہ یہ کہیں چڑھائی کرتے تھے۔ انگریزی عمل داری کی برکت سے نکسیریں بھی نہیں پھوٹتی تھیں۔ وہ جانوروں کو ہی لڑا کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے تھے۔

میں کچھ اور کہنے والا تھا کہ مرزا نے ایک جھُرجھُری لی اور یہ کہتے ہوئے کہ بھئی غضب ہو گیا شام ہونے آئی۔ کبوتر بھوکے میری جان کو رو رہے ہوں گے اور چوک کا وقت بھی آ لگا ہے۔ لال بند کا جوڑا لگانا ہے، یہ جا وہ جا۔

ان باتوں کو کوئی ایک مہینا گزرا ہوگا کہ صبح ہی صبح مرزا صاحب چلے آتے ہیں۔ آتے ہی فرمانے لگے ''پرانی عیدگاہ چلنا ہوگا۔'' میں نے کہا ''خیریت؟'' بولے '' لکھنؤوں سے پینچ ہیں۔ جانوں ڈھیری یا مالوں ڈھیری۔ پانچ روپیے، پینچ ٹھہرا ہے، بڑا معرکہ ہوگا۔'' میں نے عرض کیا ''صاحبِ عالم مجھے نہ تو پتنگ بازی سے کوئی دل چسپی ہے نہ میرے پاس اتنا فضول وقت ہے کہ آپ کے ساتھ واہی تباہی پھروں۔'' تاؤ کھا کر آنکھیں نکال لیں اور حاکمانہ انداز سے کہنے لگے ''تمھاری اور تمھارے وقت کی ایسی تیسی۔ بس کہہ دیا کہ چلنا ہوگا۔ دوپہر کو آؤں گا تیار رہنا۔'' میں بہت پریشان ہوا مگر کرتا کیا، دوستی تھی یا مذاق۔ قہرِ درویش بجانِ درویش۔ اپنی ساری ضرورتوں کو طاق پر رکھا اور حضرت مرزا چپاتی کا منتظر تھا کہ ٹھیک بارہ بجے آواز پڑی ''سیّد آؤ''۔ آگے آگے مرزا صاحب اور پیچھے پیچھے میں۔ اجمیری دروازے سے نکل کر قبرستان لانگتے پھلانگتے پرانی عیدگاہ پہنچے۔ وہاں دیکھا تو خاصا

© NCERT not to be republished

میلا لگا ہوا ہے۔ کبابی، کچالو والے، دہی بڑوں کی چاٹ، پان بیڑی، پانی پلانے والے سقّے، پوری خرافات موجود ہے۔ جا بجا پتنگ بازوں کی ٹکڑیاں بیٹھی ہیں۔ مرزا صاحب کو دیکھتے ہی ''صاحبِ عالم ادھر''، ''مرزا صاحب ادھر''، ''اُستاد پہلے میری سن لیجیے''، ''میاں ادھر آنے دو۔ بات سمجھتے ہیں نہ بات کی دُم، اُڑنے سے کام۔'' ''حضّت آپ یہاں آیئے۔ میر کنکیّا آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔'' چاروں طرف سے آوازیں پڑنے لگیں۔ مرزا چوکنّے ایک ایک کو جواب دیتے، شامیانے کے نیچے جہاں میر کنکیّا تشریف فرما تھے، پہنچے۔

میر کنکیّا لکھنؤ کے واجد علی شاہی پتنگ باز تھے۔ کاکریزی رنگ، گول چہرہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، بڑی ناک، دانتوں میں کِھڑکیاں، سر پر کٹر بڑے پٹّھے۔ خشخاشی ڈاڑھی، چھاتی کُھلا، سنجاف دار ڈھیلا ڈھالا انگرکھا، سر پر دو انگل کی کلابتّو کے حاشیے کی ٹوپی، پاؤں میں مخملی گرگابی، کلّے میں گلوری، اُٹھ کر مرزا چپاتی سے بغل گیر ہوئے۔ پھر جو پتنگ بازی کا ذِکر شروع ہوا تو تین بج گئے۔ میں بے وقوفوں کی طرح بیٹھا ہوا ایک ایک کا مُنہ تک رہا تھا۔ پتنگ بازی کی ہوتی تو اُن کی اصطلاحیں سمجھ میں آتیں۔ آخر خدا خدا کرکے لوگ اپنی اپنی ٹکڑیوں میں گئے۔ آسمان پر چیل کوّے منڈلانے شروع ہوئے۔ میں مرزا صاحب کے ساتھ تھا۔ عید گاہ کی دیوار کے نیچے سے اُنھوں نے بھی اپنا اختر بختر کھول کر ایک انگارا ادّھا اُڑایا۔ ہُچکا ایک لڑکے کے ہاتھ میں تھا۔ کوئی دس منٹ تک جھکایاں دیتے رہے، پینچ ہوا۔ کبھی آگے بڑھتے تھے کبھی پیچھے ہٹتے تھے۔ ایک دفعہ ہی جھلاّ کر لڑکے کو تمانچا رسید کیا اور بولے ''ابے ہُچکا پکڑنے کی سُرت بھی نہ تھی تو یہاں آن کیوں مرا آخر کٹوا دیا نا۔''

پھر ایک الفن بڑھائی اور اب کے ہچکا پکڑنے کی خدمت مجھے انجام دینی پڑی۔ بدقسمتی سے یہ گڈّی بھی کٹ گئی۔ بہت بگڑے کہ بس جب تم جیسے منحوس ساتھ ہوں تو ہم اُڑا چکے۔ غضب ہے سانولیا ہمیں اُستاد کہنے والا، میر گولنداز ہمارے ہاں کے شاگرد، شیخ پیچک جیسے برابر پینچ نکالے جاتے ہیں اور مرزا فخرو اوپر نیچے دو کنکوّے کٹوائے۔'' سمیٹو میاں سمیٹو مجھے اپنی استادی تھوڑی گنوانی ہے۔'' وہ کہتے رہے، میں تو وہاں سے ہٹ کر رومال بچھا کر الگ جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی اپنا اسبابِ جہالت لُنگی میں باندھے میرے پاس آ بیٹھے۔ تیوری پر بل تھے، چہرہ سُرخ، آنکھیں اُبلی ہوئی۔ میں نے کہا مرزا صاحب ہوا کا کھیل ہے۔ اس میں کسی کی کیا پیری۔ آپ کی اُستادی میں کہیں فرق آتا ہے۔ سلطنت ہی جب ہتّھے پر سے کٹ گئی تو ان دو کاغذ کے ٹکڑوں کا کیا غم! آپ، آپ ہی ہیں۔ کہنے لگے ''سچ کہتے ہو میاں۔ ہم قلعے والوں کی تقدیر ہی خراب ہے۔ ہوا بھی موافقت نہیں کرتی۔ میں نے اُن کے بشرے سے اُن کی دِلی تکلیف کا اندازہ کرتے ہوئے اس ذکر کو موقوف کر دیا۔ اور پوچھا ''کیوں مرزا صاحب قلعہ جب آباد تھا اس وقت بھی پتنگ بازی کے ایسے ہی دنگل ہوتے تھے؟''

© NCERT not to be republished

مرزا : اِک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے۔ اس وقت کا سماں کیوں کر دکھاؤں۔ میاں ہر بات میں اک شان تھی، ایک قاعدہ تھا اور ہزاروں غریبوں کی روٹیوں کے سہارے۔ معمول تھا کہ عصر کا وقت ہوا اور سلیم گڑھ پر جمگھٹ لگا۔ بڑے بڑے پتنگ، دوتاوی اور سہ تاوی تُکلّیں، ڈور کی چرخیاں لے کر شاہی پتنگ باز پہنچ گئے، خلوت کے امیر اور شوقین شہزادے مرزا نبّو، مرزا کدال، مرزا کالیٹن، مرزا چڑیا، مرزا جِھرجھری بھی آ موجود ہوئے۔ یہ سلاطین زادے بہت مُنہ چڑھے تھے۔

میں : (بات کاٹ کر) حضّت یہ نام کیسے؟ کیا اسی بولی کا نام اُردوے معلّیٰ ہے؟

مرزا : کچھ پڑھا لکھا بھی، یا گھاس ہی کھودتے رہے ہو۔ ارے زبان کی ٹکسال قلعے ہی میں تو تھی وہاں محاورات نہ ڈھلتے تو کہاں ڈھلتے۔ طبیعتیں ہر وقت حاضر رہتی تھیں۔ ہر بات میں جدّت مدِّ نظر تھی۔ ہنسی مذاق میں جو مُنہ سے نکل گیا گویا سکّہ ڈھل گیا۔ کسی کے پھٹے پھٹے دیدے ہوئے مرزا بٹّو کہہ دیا۔ لمبا چہرہ، چگّی ڈاڑھی دیکھی، مرزا چُکّا یا مرزا کدال کہنے لگے۔ چکلے چہرے والے پر چوپال کی اور ٹھنگنے پر گھٹنّے کی پھبتی اُڑا دی۔ غرض کہ مرزا چیل، مرزا جھپٹ، مرزا یاہو، مرزا رنگیلے، مرزا رسیلے، بیسوں اسم بامسمّیٰ تھے۔ میں جمعرات کو چپاتیاں اور حلوا بانٹا کرتا تھا، میرا نام مرزا چپاتی مشہور کر دیا۔

میں : لیجیے ہمیں آج تک مرزا چپاتی کی وجہ تسمیہ ہی معلوم نہ تھی۔ یہ آپ کا خیر سے ٹکسالی نام ہے۔

مرزا : اب زیادہ نہ اِتراؤ۔ قصّہ سُنتے ہو یا کوئی پھبتی سُننے کو جی چاہتا ہے۔

میں : اچھا اب کان پکڑتا ہوں بیچ میں نہیں بولوں گا۔ فرمایئے۔

مرزا : سب سامان لیس ہو گیا تو بڑے حضرت کی سواری آئی۔ دُعا سلام مجرے کے بعد حکم لے کر دریا کی طرف پتنگ بڑھایا گیا۔ دوسری جانب سے معین الملک نظارت خاں بادشاہی ناظر کا، مرزا یاور بخت بہادر یا جس کے لیے پہلے سے ارشاد ہو چکا ہے، پتنگ اٹھا۔ ریتی میں سوار کھڑے ہو گئے۔ پیچ لڑے، ڈھیلیں چلیں۔ پتنگ یا تُکلّیں چھپکتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ یا ہاتھ روک کر ڈور دی تو ڈوبتے آسمان سے جا لگیں۔ پیٹا چھوڑ دیا، ڈوریں زمین تک لٹک آئیں، سواروں نے دوشاخے بانسوں پر لے لیں۔ پتنگ کٹا تو دریا کے وار پار ڈور پڑ گئی۔ ڈوریں لٹیں۔ پتنگ کے پیچھے پیچھے غول کے غول شاہدرہ تک نکل گئے۔ جس نے وہ تکّل یا پتنگ لوٗٹی پانچ روپے کی مزدوری کی۔ ڈور بھی بیس بیس تیس تیس روپے سیر بک جاتی تھی۔ بادشاہ کبھی تو خالی سیر ہی دیکھتے رہتے۔ کبھی جی میں آتا تو تختِ رواں سے اُتر پڑتے۔ مچھلی کے چھلکوں کے دستانے پہن لیے۔ پتنگ ہاتھ میں لیا، ایک آدھ پیچ لڑایا اور ہنستے بولتے محل معلّیٰ میں داخل ہو گئے۔ سیّد! یہ بھی خبر ہے کہ وہ پتنگ یا تکّلیں کتنی بڑی اور کیسی محنت سے بنائی ہوئی ہوتی تھیں۔ تکلّیں تو تمھارے پیدا ہونے سے پہلے مر چکیں۔ خیر میں کبھی ان

© NCERT not to be republished

کی تصویر دکھاؤں گا۔تو وہ قدِ آدم ہوتی تھی اور ایک ایک کی تیاری میں کئی کئی دن لگ جاتے تھے۔ ڈوریں بھی اِک بلی، دو بلی، تبلی، چوبلی کنکّوں اور تکلّوں کے زور کے موافق بنتی تھیں۔ مانجھوں کے نسخے بھی ہر گھرانے کے الگ تھے۔تکّلیں تو تکّلیں آج ویسے پتنگ بھی نہ بنتے ہیں نہ کسی میں اتنا بوتا ہوتا ہے کہ اُن کی جھونک سنبھال سکے۔ چھوٹی تنّخیں رہ گئی ہیں یا بڑے نامی پتنگ بازوں کے ہاں ادّھے۔ وہ بھی کنکوّے نہیں گڈّیاں ہوتی ہیں۔لنڈوری بن پنچھلّے کی۔

میں : بھئی واقعی لُطف تو بڑا آتا ہوگا۔

مرزا : جہاں اپنی حکومت، گھر کی بادشاہت اور پرائی دولت ہوتی ہے، یہی رنگ ہوا کرتے ہیں۔عشرت گاہوں میں ہر وقت نمازیں نہیں پڑھی جاتیں۔ مجاہدے اور مراقبے نہیں ہوتے، یہ نہ اٹھائیں تو زندگی کی راحتیں کون اٹھائے۔ دنیا میں ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ سلطنتوں کی بھی عمریں ہوتی ہیں۔ جس طرح آدمی کوئی پیٹ میں، کوئی پیدا ہوتے ہی، کوئی بچپن میں، کوئی جوان ہوکر، اور کوئی عمرِ طبعی طے کرنے کے بعد مرتا ہے، اسی طرح بادشاہتیں ہیں۔ کوئی ایک پُشت چلتی ہے، کوئی دو پُشت۔ کسی کا سلسلہ سو پچاس ہی برس میں ٹوٹ جاتا ہے اور کسی کی عمارت صدیوں کی خبر لاتی ہے۔ مغلوں نے چھے سو برس تخت کو سنبھالا۔ آخر بڑھاپا تو سب ہی کو آتا ہے۔ اُن کے کندھے بھی شل ہو گئے۔ دنیا کا یہی کارخانہ ہے۔ آج اس کا، تو کل اس کا زمانہ ہے۔ موت اور زوال بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ ہمارے لیے عیش وعشرت ہی بہانہ ہوگئی۔

میں سمجھتا تھا کہ مرزا نرے شہزادے ہیں اور ان کی معلومات میں بازیوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ آج معلوم ہوا کہ قلعے والوں کا دماغ بگڑی میں بھی کتنا بنا ہوا تھا۔ میں نے کہا ”مرزا صاحب! یہ آپ نے کس فلسفی کا لکچر یاد کرلیا ہے۔ دو چار جملوں میں کیسے کیسے نکتے حل کر گئے۔“ بولے ”پیارے ہمارے احوال پر نہ جاؤ۔ جان کر دیوانے بنے ہوئے ہیں۔ نہیں تو کیا نہیں جانتے کیا نہیں آتا

عالم میں اب تلک بھی مذکور ہے ہمارا
افسانۂ محبت مشہور ہے ہمارا“

—— اشرف صبوحی

© NCERT not to be republished

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ مرزا چپاتی کون تھے اور ان کا حلیہ کیا تھا؟
2۔ مرزا چپاتی نے اردو زبان کی جو قسمیں بتائیں ان کے نام اور خصوصیات لکھیے۔
3۔ مرزا چپاتی نے کیوں کہا کہ "دنیا کا یہی کارخانہ ہے۔ آج اس کا، تو کل اُس کا زمانہ ہے۔"
4۔ قلعے کی پتنگ بازی اور آج کی پتنگ بازی میں کیا فرق ہے؟

© NCERT not to be republished

محمد طفیل

(1923 – 1986)

محمد طفیل معروف ادبی رسالے ماہنامہ ''نقوش'' لاہور کے مدیر تھے۔ نقوش اردو کے مشہور اور معیاری جریدوں میں شمار ہوتا ہے۔ نقوش کا ایک اہم امتیاز اس کے ضخیم خاص نمبروں کی وجہ سے ہے۔ آپ بیتی نمبر، لاہور نمبر، منٹو نمبر، پطرس نمبر، شخصیات نمبر اور سب سے زیادہ رسول نمبر کی وجہ سے ہماری ادبی صحافت کی تاریخ میں نقوش کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ نقوش 1948 سے جون 1986 تک محمد طفیل کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔

محمد طفیل ایک اچھے مدیر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب خاکہ نگار بھی تھے۔ ان کے لکھے ہوئے خاکوں کے مجموعے ''مخدومی''، ''محبی''، ''معظّم''، ''مکرم''، ''محترم''، ''آپ''، ''جناب'' اور ''صاحب'' کے ناموں سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔

محمد طفیل کا مشاہدہ گہرا تھا۔ صاف گوئی، بے باکی اور بیان کی روانی ان کی تحریروں کے اوصاف ہیں۔ خاکہ ''جگر صاحب'' محمد طفیل کی کتاب ''صاحب'' سے ماخوذ ہے۔

© NCERT not to be republished

5019CH12

جگرؔ صاحب

ٹیکا ٹیک دوپہری تھی وہ بھی لکھنؤ کی۔ میں خوب مزے سے سویا ہوا تھا اس لیے کہ پنکھا اور پسینہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اہلِ لکھنؤ کی طرح سے نہ دھوپ میں لطافت تھی نہ نزاکت۔ نہ جانے اللہ میاں نے دھوپ کے سلسلے میں لکھنؤ والوں کے شاعرانہ مزاج کا خیال کیوں نہیں رکھا۔ دھوپ کے ساتھ لوٗ بھی سونے پہ سہاگہ۔ حالاں کہ چاہیے یہ تھا کہ وہاں کے رہنے والوں کے مذاق کے مطابق ہلکی سی دھوپ ہوتی جسے اہلِ مذاق پیار میں ’دھوپیہ‘ کہتے۔

لکھنؤ کی سرزمین ہی ایسی ہے کہ وہاں آپ کو قدم قدم پر شاعر ملیں گے۔ بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ وہاں سب سوتے اور جاگتے میں شعر ہی کہتے ہیں اور شعر ہی سنتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر مجھ پر بھی یہ اثر ہوا کہ سوتے ہی سوتے شعر سُنے۔ ان میں سے ایک شعر میں آپ کو بلا ترنّم سُناتا ہوں

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت عام نہیں

میں بیدار ہونے کے موڈ میں نہ تھا۔ لیکن اس شعر کے ساتھ جو ترنّم تھا اس نے کچھ کچھ آنکھیں کھول دیں۔ پھر دوسرا شعر نیم بے داری کی حالت میں آدھا سُنا آدھا اونگھ گیا، تیسرے شعر نے خاصا چونکا دیا۔ رفتہ رفتہ نیند غائب تھی اور میں بیدار۔ پہلے خیال آیا کہ شوکت تھانوی صاحب اپنے اشعار جگرؔ صاحب کی لے میں پڑھ رہے ہیں۔ (اس لیے کہ ان دنوں میرا قیام شوکت صاحب کے یہاں تھا) لیکن اس بات کا فیصلہ جلد ہی کر لینا پڑا کہ اشعار جگر صاحب ہی کے ہیں...... اتنے میں شوکت صاحب نے آواز دی۔

’’بھئی طفیل جاگ رہے ہو، ادھر آؤ تمھیں ایک چیز دکھائیں۔‘‘ میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں آیا تو چیز کے بجائے جگرؔ صاحب کو دیکھا...... شوکت صاحب نے جگرؔ کی طرف اشارہ کر کے کہا آپ انھیں جانتے ہیں؟

’جی ہاں‘

شوکت صاحب کو میرا صرف جی ہاں کہنا پسند نہ آیا اس لیے اُنھوں نے بات بڑھائی بھلا کون ہیں؟...... جواباً گزارش کی کہ ’’انھیں تو سب جانتے ہیں لیکن یہ سب کو نہیں جانتے۔‘‘

© NCERT not to be republished

اس پر جگؔر صاحب کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ کھیل گئی اور شوکت صاحب سے میرے متعلق پوچھا ''آپ کی تعریف؟'' میں نے سوچا کہ میرا تعارف کوئی دوسرا کیوں کرائے ......اپنا بھرم یہ کہہ کر رکھ لینا چاہا کہ ''میرا نام محمد طفیل ہے'' ......یہ تھا میرا جگؔر صاحب سے پہلا باقاعدہ تعارف ......

جگؔر صاحب کے شعری کارنامے امٹ ہیں۔ جگر صاحب نے خود اپنے ہاتھ سے شعری ادب کی تاریخ میں اپنا نام جلی حروف سے لکھ دیا ہے اور یہ کسی کے مٹائے مٹنے والا نہیں ...... اچھا انسان ہی اچھے شعر کہہ سکتا ہے۔ یہ بات کسی اور کے لیے صحیح ہو یا نہ ہو، جگؔر صاحب کے سلسلے میں غلط نہیں کہ سچے شاعر کا ماحول سے متاثّر ہونا لازمی ہے...... جگؔر صاحب کی سوچ اور اس کے اظہار اور عمل میں تضاد نہیں، کھوج لگانے سے کوئی نہ کوئی کمزوری اُن میں مل ہی جائے گی۔ میں بھی نہیں چاہتا کہ ہم اچھّے بھلے انسان کو فرشتہ کہہ کر اس کی تذلیل کریں لیکن کھوج لگانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اگر کھوج لگانا ہی ہے تو مقابلتاً کھوج لگایئے اور پھر دیکھیے کہ جگؔر صاحب کتنے اونچے مقام پر ہیں ...... جگؔر صاحب بڑے خوش مذاق ہیں ہر وقت بقراط بنے نہیں بیٹھے رہتے۔ دوستوں کو دیکھ کر، کِھل اور کُھل جاتے ہیں۔ باتوں باتوں میں کوئی نہ کوئی فقرہ چپکا دیں گے پھر کِھلکھلا کر ہنسیں گے پھر ذرا سی ہنسی کو روکیں گے اور ''اؤں'' کہہ کر پھر ہنسیں گے اور خوب ہنسیں گے۔ ایک محفل میں جگؔر صاحب شعر سُنا رہے تھے اور ایک صاحب بے نیاز سے بیٹھے تھے۔ ایک شعر پر انھوں نے ایکا ایکی اور بے ساختہ داد دے ڈالی۔ جگؔر صاحب ان کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا۔

''آپ کے پاس قلم ہے؟''

''کیا کیجیے گا؟''

میرے اس شعر میں ضرور کوئی خرابی ہے ورنہ آپ داد نہ دیتے۔ اس لیے اسے اپنے دیوان سے خارج کرنا چاہتا ہوں۔

......جگؔر صاحب روز بروز فلسفی اور ''ولی اللہ'' بنتے جا رہے ہیں۔ ہر بات کو فلسفیانہ رنگ میں سوچیں گے۔ مذہبی رنگ میں اس پر تبصرہ کریں گے ...... جگؔر صاحب اپنی باتوں میں بعض اوقات ایسے ڈوب جاتے ہیں کہ دوسرے کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ اگر دوسرے کے پلے کچھ پڑ گیا تو مزا آ گیا۔ ان کی باتیں غزل کے شعر ہوتی ہیں۔ جس طرح غزل کے شعر اپنے مفہوم کے اعتبار سے علاحدہ علاحدہ حیثیت رکھتے ہیں اُسی طرح جگر صاحب کی باتوں کا مسئلہ ہے۔ ...... گفتگو میں اضافتوں کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ باتیں کسی پڑھے لکھے انسان سے ہو رہی ہیں۔ ...... انھیں اس بات کا بڑا صدمہ ہے کہ لوگ ان کی دعوتیں کرتے ہیں اور پھر قیمت وصول کرنے کے لیے ان سے شعروں کی فرمائش کرتے ہیں۔ ...... اگر ان کی کوئی چیز چوری ہو جائے تو یہ کہتے ہیں کہ ''اگر چور صاحب مجھ سے پوچھ لیتے کہ جگؔر صاحب مجھے آپ کی فلاں چیز کی ضرورت ہے تو میں چور صاحب سے کہتا کہ لے جاؤ۔''

© NCERT not to be republished

جگؔر صاحب اوّل تو بہت کم لوگوں کو خط لکھتے ہیں، جنھیں لکھتے ہیں ان میں سے ہر ایک کے خط کا مضمون قریب قریب یکساں ہوتا ہے ۔ وہی خلوص، وہی محبت ، وہی یگانگی ...... ہر ایک سے ایک سطح پر ملیں گے ۔خواہ کوئی گورنر جنرل ہو، خواہ معمولی کلرک۔ یہ بات ہرایک میں کہاں؟ مشرقیت ان کی رگ و پے میں موجزن ہے ۔کسی کے ہاں ملنے جائیں گے تو اس کے بچوں کے لیے مٹھائی پھل یا کھلونے لے جائیں گے۔طبیعت میں جماؤ نہیں، ذرا سی خلافِ طبیعت بات ہوئی تو سمجھیے آئی شامت ۔احباب سے ملنے میں پہل کرتے ہیں۔جگؔر صاحب گھر کے بجائے سفر میں رہتے ہیں۔ انھوں نے اتنا سفر کیا ہوگا کہ اگر وہ تمام اعداد وشمار جمع کر لیے جائیں تو مجموعی حیثیت سے انھوں نے متعدد بار تمام دنیا کا سفر کر لیا ہوگا۔

جگؔر صاحب ہر بات میں نفاست پسند ہیں۔نفاست ان کی زندگی ہے ، بظاہر ان کی نفاست پر کوئی زندگی نہیں برستی ۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نے پہلی بار انھیں کسی مشاعرے میں پڑھتے سُنا تو اس نے بآواز بلند کہا کہ جتنے یہ بدصورت ہیں، پڑھتے ہوئے اتنے ہی خوب صورت معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ جن کی نظریں ان کے چہرے سے ہٹ کر ان کے دل کو بھی ٹٹول آتی ہیں وہ چہرے کے بھدے سے سیاہ رنگ کو بھول جاتے ہیں۔جگؔر صاحب بڑی بھول بھلیّاں ہیں۔ اُنھیں کوئی بات یاد نہیں رہتی ۔ آپ کا ان کا ہفتوں ساتھ ہو جائے اتفاق سے درمیان میں دو چار برس ملاقات نہ ہو تو وہ آپ کو قریب قریب بھول جائیں گے۔دوبارہ ملاقات پر جب آپ ان سے کہیں گے کہ جگؔر صاحب پہچانا ؟ تو وہ کہیں گے ”بھئی ! کچھ آنکھیں مانوس ہیں اس وقت یاد نہیں آرہا ہے کہ کہاں ملاقات ہوئی تھی۔“ اب انھوں نے یادداشت کا یہ طریقہ نکالا ہے کہ ایک ڈائری پر لکھتے رہتے ہیں۔لیکن برا ہو یادداشت کا کہ اب یہ بھی پتہ نہیں کہ ڈائری کہاں رکھی ہے۔ حفظِ ماتقدم کے لیے وہ عرصے سے اپنے ساتھ ایک مددگار رکھتے ہیں اس کے باوجود وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ان کے یوں کھوئے کھوئے رہنے سے کئی لوگ ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں۔یہ اپنی سیکڑوں چیزیں گم کرتے رہتے ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں نے لکھنؤ میں یہ بات سنی کہ کل جگؔر صاحب کا بٹوہ گم ہو گیا ہے اور اس میں ہزار بارہ سو روپے تھے، چنانچہ بھوپال ہاؤس اس حادثے کے افسوس کے لیے پہنچا اور پوچھا۔

”آپ کو کچھ معلوم نہیں کہ بٹوہ کیسے اور کہاں گم ہوا ؟“ کہنے لگے مجھے سب کچھ معلوم ہے۔کل ایک صاحب سے چلتے چلتے ملاقات ہوئی تھی انھوں نے بڑی نیازمندی کا اظہار کیا ۔ میں نے سوچا کوئی ملنے والا ہوگا ۔ بازار سے کچھ سودا سلف خریدا پھر تانگے میں بیٹھے اور یہاں آئے ۔راستے میں ان صاحب نے میری جیب سے کچھ نکالا۔میں نے سوچا مجھے کچھ بدگمانی ہوئی ہے، یہ بات نہیں ہوسکتی ۔ جب جیب کو ٹٹولا تو بٹوہ غائب تھا۔ میں نے اپنا بٹوہ ان کے پاس اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔لیکن میں نے ان سے

© NCERT not to be republished

کچھ کہا نہیں۔''

میں نے پوچھا کیوں؟

''کہنے لگے اگر میں اُن سے یہ کہتا کہ میرا بٹوہ آپ نے چرالیا ہے تو اُس وقت جو اسے پشیمانی ہوتی، وہ مجھ سے نہ دیکھی جاتی۔''

داستاں خواہ مخواہ طویل ہوگئی ورنہ بات تو دو سطروں میں ہوسکتی تھی۔وہ یوں کہ جگؔر صاحب کی شخصیت نے مجھے بہ حیثیت انسان کے اتنا متاثر کیا ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد اُنگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ یہ میری بھی بدقسمتی ہے اور ماحول کی بھی۔

—— محمد طفیل

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ خاکہ نگار پہلی مرتبہ جگؔر صاحب سے کس طرح متعارف ہوا؟

2۔ لکھنؤ کی سرزمین کے متعلق خاکہ نگار نے کیا بات کہی ہے؟

3۔ خاکہ نگار نے کیوں کہا ہے کہ جگؔر صاحب کی باتیں غزل کے شعر ہوتی ہیں؟

4۔ جگؔر صاحب کی شخصیت کے کس پہلو سے آپ متاثر ہوئے، بیان کیجیے۔

© NCERT not to be republished

© NCERT not to be republished